فہرست

اداریہ	ابتدا تیرے نام سے	صائمہ اسما	6
انوارِ ربانی	قرآن کا معجزہ	ڈاکٹر مقبول احمد شاہد	8
قولِ نبیؐ	جادو سے حفاظت اور علاج	فریدہ خالد	12
خاص مضمون	بنگلہ دیش کا سفر	ڈاکٹر نثار احمد چیمہ	15
نوائے شوق	حمد	شمیم فاطمہ	21
	غزل	صہیب اکرام	21
	دسمبر	شمیم فاطمہ	22
	یہ دیوانے	ڈکیہ فرحت	23
حقیقت وافسانہ	زحمت سے رحمت	قانتہ رابعہ	24
	مری ذات کا جو نشاں ملے	جویریہ سعید	27
	نایاب	شاہدہ ناز قاضی	32
	خوابِ گل پریشاں ہے	فرحت طاہر	35
	مداخلت	فرحی نعیم	37
طویل کہانی	ہم کہ ٹھہرے اجنبی	ڈاکٹر بشریٰ تسنیم	41
سلسلہ وار کہانی	مونالیزا	نصرت یوسف	51
مطالعہ گاہ	میری لائبریری سے	قانتہ رابعہ	55
روداد	ایک خوشگوار شام	سامیہ احسن	60
شاخِ نازک پہ آشیانہ	امریکہ یاترا اور گوری کے ساتھ مکالمہ	پروفیسر رضیہ خان	62
انشائیہ	آخری فیصلہ	ربیعہ ندرت	65
نمایاں خواتین کا تذکرہ	مہر ماہ سلطان	آسیہ راشد	67
خفتگانِ خاک	جدائی	ڈاکٹر ممتاز عمر	69
ہلکا پھلکا	آج کچھ درد مرے دل میں	ذروہ احسن	71
بتول میگزین	ساجدہ رفیق، ام صائم		73
گزرا ہوا زمانہ	عمرؓ فاروق	قرۃ العین ارشد	75
منتخب کالم	فیس بک کا استعمال	انیس احمد خاں	78
	شہید بلتاجی کا بیٹی کے نام خط		80

ابتدا تیرے نام سے

قارئین کرام! دسمبر کی اداسی میں بھیگی، دلوں کو گداز کرتی سوگوار شامیں کئی یادیں اپنے جلو میں لے کر آتی ہیں۔

دھڑکنیں تیز ہوئیں اور قدم رکنے لگے
پھر ترے شہر میں آکر تری دیوار کے پاس
اُس کو ہر صاحبِ تعبیر سے محفوظ ہی رکھ
وہ جو اک خواب ہے اس چشمِ گنہ گار کے پاس

بنگلہ دیش میں نصف صدی بعد بھی جرم وفا کرنے والے عقوبت کے سزاوار ہیں۔ ساتھ ہی 1971ء کے سانحے سے گھائل دلوں کے زخم پھر نئے سرے سے مہکنے لگے ہیں۔ 16 دسمبر کا دن قریب آیا ہے تو گزرے ہوئے کل کی یاد نئی آب وتاب سے لو دینے لگی ہے۔ جرم اتنا بڑا تھا کہ وقت کی سال بہ سال تہہ در تہہ جمتی ہوئی گرد بھی اس کی سنگینی کو کم نہ کر سکی! بقول فیضؔ

؎ کہ سنگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد!

محرم الحرام امن وامان سے گزر گیا۔ اگرچہ راولپنڈی کے سانحے نے اس امن کو داغدار کر دیا۔ پولیس وقت پر نہ پہنچی، انتظامیہ کو غفلت کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ مگر یہ بھی نظر آیا کہ ملک میں امن کا قیام ناممکنات میں سے نہیں، محض ارادے کی ضرورت ہے۔

امریکی ڈرون حملوں کے خلاف عوامی احتجاج زور پکڑ رہا ہے۔ ملک بھر میں تحریکِ انصاف اور جماعت اسلامی کے دھرنے اور ریلیاں جاری ہیں جن کا موقف یہ ہے کہ یہ حملے ملکی سلامتی اور خودمختاری کے خلاف اور ظلم پر مبنی ہیں۔ کے پی میں نیٹو سپلائی روک دینے کی بھی اطلاعات ہیں۔ جبکہ ایک معروف ٹی وی چینل نیٹو سپلائی کے مالی فوائد گنوانے میں مصروف رہا۔ یہ نقطۂ نظر نا قابل فہم ہے۔ کیا ڈالروں کے بدلے میں ملکی سلامتی اور خودمختاری کو لاحق سنگین خطرات پر سمجھوتہ کیا جا سکتا ہے؟

؎ بس ایک منزل ہے بوالہوس کی ، ہزار رستے ہیں اہلِ دل کے
یہی تو ہے فرق مجھ میں اُس میں ، گزر گیا میں ، ٹھہر گیا وہ

اور یہ ڈالروں کی دلیل بھی کیا حقیقت رکھتی ہے جبکہ یہ اعداد وشمار بھی سامنے آ چکے ہیں کہ دہشت گردی کی اس جنگ میں تعاون پاکستان کو کتنا مہنگا پڑا ہے۔ فوجی تعاون اور انفراسٹرکچر کی بدحالی کا نقصان، بدلے میں ملنے والے ڈالروں سے کہیں زیادہ ہے اور بیرونی سرمایہ کاری میں کمی نے الگ معیشت کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔ پاکستان کے لئے ڈالروں کی یہ بارش اتنی ہی فائدہ مند ہے تو آج ہم بدحالی اور مہنگائی کی اس حد پر کیوں پہنچ گئے کہ سبزی خریدنا بھی عام آدمی کی استطاعت سے باہر ہو گیا ہے۔ پٹرول اور بجلی کے نرخ چند ماہ سے زیادہ مستحکم نہیں رہتے اور ان کے نتیجے میں ہر چیز مہنگی ہو جاتی ہے۔ آئی ایم ایف کے آگے پھر ہم دست سوال دراز کر چکے ہیں۔ اس جنگ نے ہمیں ذلت ورسوائی، غربت وبدحالی اور بدامنی ودہشت گردی کے سوا کچھ نہیں دیا۔

مذاکرات کے دوران ڈرون حملے نہ ہونے کے بارے میں سرتاج عزیز صاحب کی بریفنگ کی بازگشت بھی نہ تھمی تھی کہ ہنگو کے ایک مدرسے پر ظالمانہ حملے نے کمسن طلبہ اوران کے اساتذہ پر مشتمل 6 معصوم افراد کی جان لے لی۔ اس سے قبل چوہدری نثار علی خان کی دھواں دھار تقریر نے بھی ان حملوں کا کچھ نہیں بگاڑا۔ ''ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ'' کے مصداق ہمارے اربابِ اختیار کی اپنے آقاؤں کے ساتھ اندر خانے سودے بازی کچھ اور ہوتی ہے اور عوام کے سامنے مؤقف اور۔ جس طرح وکی لیکس نے یوسف رضا گیلانی کی امریکہ کے ساتھ ڈرون پر رضامندی اور عوام کے سامنے اس کی مذمت کی پالیسی کا انکشاف کیا تھا، اسی طرح کا معاملہ آج بھی محسوس ہوتا ہے۔ محض چہرے اور نام بدلنے سے تبدیلی کیسے آسکتی ہے!

گزشتہ ماہ لاپتہ افراد کے لواحقین پر مشتمل ریلی نے بلوچستان سے پیدل کراچی کا سفر کیا۔ یہ لوگ جو اپنے کھوئے ہوئے پیاروں کے انتظار میں سالہا سال سے نہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں، ان کو اس جان کنی کی کیفیت سے کون نکالے گا؟ ان کی آنکھیں ان کے پیاروں کی دید سے کون ٹھنڈی کرے گا؟ یہ لوگ حکومت اور عدالت عالیہ سے آس لگائے بیٹھے ہیں۔ انسانی حقوق کی تنظیموں کی جانب سے اب تک کوئی مؤثر احتجاج یا دباؤ سامنے نہیں آیا۔ جبکہ اس مسئلے کی سنگینی بین الاقوامی نوعیت کی ہے۔ امریکہ کی اس بدنام جنگ نے دنیا بھر میں کتنے گھروں میں اندھیرے بھرے ہیں۔ ''سرحدوں سے ماورا'' اس جنگ سے آج دنیا کا کوئی پرامن شہری خود کو محفوظ نہیں سمجھتا ''بلیک واٹر'' کے مصنف جیریمی ساحل کی تازہ تصنیف ''ڈرٹی وارز'' امریکہ کی اس بین الاقوامی دہشت گردی کے مزید پرت کھولتی ہے۔

امجد اسلام امجد کے ان حسب حال اشعار کے ساتھ اجازت ؎

عشاق ، نہ پتھر نہ گدا کوئی نہیں ہے
اب شہر میں سایوں کے سوا کوئی نہیں ہے
بچھڑے ہوئے لوگوں کا پتہ کون بتائے
رستوں میں بجز یادِ بلا کوئی نہیں ہے
امجدؔ یہ مرا دل ہے کہ صحرائے بلا ہے
مدت سے یہاں آیا گیا کوئی نہیں ہے

دعا گو

صائمہ اسما

ایک دکھ بھری خبر یہ ہے کہ بتول کی ایک مستقل قاری اور محشر خیال میں اکثر پابندی سے شرکت کرنے والی گوجرہ سے ہماری بہن رفعت اشتیاق خالقِ حقیقی سے جاملیں۔ ان کا آخری خط نومبر کے شمارے میں شامل ہے۔ جہاں ان کے اہل خانہ اور احباب ایک نیک صفت محبوب ہستی سے جدا ہوئے، وہیں بتول اپنی ایک بہت اچھی قدر دان شخصیت سے محروم ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی بہترین میزبانی کرے آمین۔

مدیرہ

ڈاکٹر مقبول احمد شاہد

قرآن کا معجزہ

وہ کتاب جس کے مقابلے میں دنیا کی کوئی کتاب نہیں لائی جاسکتی، جو زبان وادب کے لحاظ سے بھی معجزہ ہے اور تعلیم وحکمت کے لحاظ سے بھی

☆تخلیق کائنات کے بارے میں قرآن کا بیان

ایک وقت تھا جب یہ زمین و آسمان موجود نہیں تھے پھر اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو اس شکل میں پیدا کرنے کا فیصلہ کیا اور چھ دنوں میں یہ کام مکمل ہو گیا۔ اس سارے عمل تخلیق کی کیفیت اللہ تعالیٰ نے مختصراً اس طرح بیان فرمائی:

''کیا یہ لوگ غور نہیں کرتے کہ یہ آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے پھر ہم نے انھیں جدا کیا اور پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی۔ کیا وہ پھر بھی ایمان نہیں لاتے۔'' (الانبیاء ۳۰)

''وہ اللہ ہی ہے جس نے رات اور دن بنائے اور سورج اور چاند کو پیدا کیا۔ سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں۔'' (الانبیاء ۳۳)

رتق کے معنی ہیں یکجا ہونا، اکٹھا ہونا، ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہونا اور فتق کے معنی جدا کرنے اور پھاڑنے کے ہیں۔ اس سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ ابتدائی طور پر پوری کائنات ایک تودے (Mass) کی شکل میں تھی۔ بعد میں اس کو الگ الگ حصوں میں تقسیم کر کے زمین، آسمان اور دوسرے اجرامِ فلکی، کہکشائیں جدا جدا دنیاؤں کی شکل میں بنادی گئیں۔ جب یہ آیات نازل ہوئیں تو اس وقت علم فلکیات بہت ابتدائی شکل میں تھا۔ اور اس بات کو پوری طرح سمجھنا مشکل تھا۔ اس کے بعد اس علم نے ترقی کی تو سائنس دانوں نے بہت غور وخوض کے بعد یہ نظریہ پیش کیا کہ کائنات اپنی اس موجودہ صورت میں تخلیق پانے سے پہلے مادے کے ایک بہت وسیع وعریض تودے کی شکل میں تھی پھر ایک عظیم دھماکا (Big Bang) وقوع پذیر ہوا اور اس تودے سے یہ زمین و آسمان، اور تمام اجرامِ فلکی اور کہکشائیں وجود میں آئیں اور ہر ستارہ وسیارہ بکھر کر اپنی اپنی جگہ پہنچ گیا اور سب اپنے اپنے مخصوص مداروں میں گردش کرنے لگے۔ پہلے یہ بھی سمجھا جاتا تھا کہ سورج ساکن ہے اور زمین سمیت دس سیارے اس کے گرد گردش کر رہے ہیں لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ سورج سمیت سارا نظام شمسی متحرک ہے۔

قدیم زمانے میں لوگوں کے لیے آسمان وزمین کے رتق اور فتق اور پانی سے ہر زندہ چیز کے پیدا کیے جانے اور تاروں کے ایک ایک فلک میں تیرنے کا مفہوم کچھ اور تھا۔ موجودہ زمانے میں طبیعات، حیاتیات اور علم الافلاک کی جدید معلومات نے ہمیں

حقیقی مفہوم کے زیادہ قریب کر دیا ہے اور موجودہ زمانے کا انسان ان آیات کو بالکل اپنی جدید معلومات کے مطابق پاتا ہے۔

ان جدید معلومات کا خلاصہ یہ ہے کہ،''ہماری اس کائنات کا ایک حتمی نقطۂ آغاز ہے۔ایک دور تھا جب کچھ بھی نہیں تھا یہاں تک کہ خلا (Space) کا بھی کوئی وجود نہیں تھا پھر چودہ ارب سال پہلے ایک لمحہ ایسا آیا کہ کوئی چیز تخلیق ہوئی۔ اس کو سائنس کی زبان میں Singularity کہا جاتا ہے۔ یہ انتہائی گرم اور کثیف مادہ تھا۔اس کی تخلیق سے پہلے نا خلا کا وجود تھا نا وقت کا، نہ مادے کا اور نا ہی توانائی کا۔ یہ سب چیزیں Big Bang کے عمل کے ذریعے اس مادے (Singularity) سے برآمد ہوئیں۔اگر خلا کا وجود بھی نہیں تھا تو یہ مادہ کہاں وجود میں آیا؟ یہ ہمیں معلوم نہیں ہے۔ہمیں یہ بھی نہیں پتہ کہ یہ مادہ کہاں سے آیا۔ کیوں آیا اور اس ساری کائنات کا محل وقوع کیا ہے۔ جو ہمیں معلوم ہے وہ بس یہ ہے کہ اب ہم اس کائنات کا حصہ ہیں اور اس کے اندر موجود ہیں۔ایک وقت تھا نہ کائنات کا وجود تھا اور نہ ہی ہمارا۔''

Big Bang تھیوری پر بحث کرتے ہوئے ایک سائنس دان مزید لکھتا ہے:

''اس تھیوری پر کوئی بھی بحث اس وقت تک نامکمل رہے گی جب تک یہ نہ پوچھا جائے کہ پھر خدا کے متعلق کیا تصور ہے۔یہ اس لیے ہے کہ Cosmogony یعنی کائنات کی تخلیق کی ابتدا کا علم ایک ایسا موضوع ہے جہاں سائنس اور دین کا علم آپس میں ملتے نظر آتے ہیں۔تخلیق ایک مافوق الفطری عمل تھا جو عام معمولات سے ہٹ کر وقوع پذیر ہوا۔اس حقیقت سے خود بخود یہ سوال جنم لیتا ہے کہ کیا اس کائنات کے باہر کوئی ایسی عظیم تخلیق کار قوت موجود ہے جو اس کائنات کی تخلیق کے آغاز کا سبب بنی..... کیا وہی خدا ہے؟''

☆ کائنات وسعت پذیر ہے:

کائنات کی تخلیق کے بارے میں قرآن مجید میں متعدد مقامات پر توجہ دلائی گئی اور یہ بات خاص طور سے کہی گئی کہ اس کا خالق صرف اور صرف اللہ وحدہ لاشریک ہے۔لیکن سورۃ الذاریات میں یہ بات ایک مختلف انداز سے یوں فرمائی گئی:

''آسمان کو ہم نے اپنے زور سے بنایا ہے اور ہم اس کو وسعت دے رہے ہیں اور زمین کو ہم نے بچھایا ہے اور ہم بڑے اچھے ہموار کرنے والے ہیں۔''
(الذاریات ۴۷،۴۸)

قرآن میں جہاں زمین اور آسمان کا ذکر آتا ہے اس سے مراد پوری کائنات (Universe) ہوتی ہے۔ مذکورہ آیات کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پوری کائنات خود اپنی قوت اور زور سے پیدا کی ہے اور اسی

میں کسی اور کا کوئی حصہ نہیں ہے۔لیکن پہلی آیت میں جو لفظ ''موسعون'' استعمال ہوا ہے، یہ ایک نئی بات ہے جو یہاں کہی گئی ہے۔اس کی تشریح کرتے ہوئے سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے تفہیم القرآن میں یوں لکھا ہے:

''اصل الفاظ ہیں 'وانا لموسعون' موسع کے معنی طاقت اور قدرت رکھنے والے کے بھی ہو سکتے ہیں اور وسیع کرنے والے کے بھی۔ پہلے معنی کے لحاظ سے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ یہ آسمان ہم نے کسی کی مدد سے نہیں بلکہ اپنے زور سے بنایا ہے اور اس کی تخلیق ہماری مقدرت سے باہر نہ تھی۔ پھر یہ تصور تم لوگوں کے دماغ میں آخر کیسے آ گیا کہ ہم تمھیں دوبارہ پیدا نہ کر سکیں گے؟ دوسرے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہے کہ اس عظیم کائنات کو ہم بس ایک دفعہ بنا کر نہیں رہ گئے ہیں بلکہ اس میں مسلسل توسیع کر رہے ہیں اور ہر آن اس میں ہماری تخلیق کے نئے نئے کرشمے رونما ہو رہے ہیں۔ایسی زبردست خلاق ہستی کو آخر تم اعادۂ خلق سے عاجز کیوں سمجھ رکھا ہے؟''

قدیم زمانے سے مفسرین نے موسع کا مطلب طاقت اور مقدرت رکھنے والا ہی لیا ہے۔وسعت دینے کا ترجمہ پہلی مرتبہ تفہیم القرآن میں یا سعودی عرب سے شاہ فہد قرآن کریم پرنٹنگ کمپلیکس کے زیر اہتمام شائع ہونے والے قرآن کریم میں مولانا صلاح الدین یوسف کے تفسیری حواشی میں میری نظر سے گزرا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ رہی ہو گی کہ کائنات کے وسعت پذیر ہونے کے امکان کی طرف کسی کی توجہ نہیں گئی ہو گی۔لیکن اب علوم فلکیات کے ماہرین نے یہ بات دریافت کی ہے کہ یہ کائنات مسلسل پھیل رہی ہے اور پھیلاؤ (Expansion) کا یہ عمل کائنات کی تخلیق کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا۔اس بارے میں اس وقت سائنسی معلومات کا خلاصہ کچھ اس طرح سے ہے:

''تاروں بھری رات میں آسمان پر نظر ڈالیں تو کائنات کی ایک پرسکون اور ساکت تصویر سامنے آتی ہے۔لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔۱۹۲۹ء میں Edwin Hubble کی یہ انقلاب انگیز دریافت لوگوں کے لیے حیرانی کا باعث بنی کہ اصل میں کائنات انتہائی تیز رفتاری سے پھیل رہی ہے۔Hubble کے مشاہدے میں یہ بات آئی کہ آسمان پر نظر آنے والے Milky Way (شارع ابیض) سے باہر جو کہکشائیں ہیں وہ تیزی سے ہم سے دور ہوتی جا رہی ہیں اور ان کی دور ہونے کی رفتار ہماری زمین سے ان کے فاصلے کے تناسب سے ہے۔یعنی جو کہکشاں ہم سے جتنی دور ہے اتنی ہی زیادہ تیز رفتاری سے وہ ہم سے مزید دور ہوتی جا رہی ہے۔اس مشاہدے سے اس نے فوراً یہ نتیجہ اخذ کیا کہ کائنات کی تاریخ میں ضرور ایک دور ایسا تھا جب پوری کائنات ایک نقطے پر مجتمع تھی اور پھر ایک ایسا لمحہ آیا کہ کائنات کی تخلیق اسی نقطے کے پھیلاؤ (Big

(Bang سے وقوع پذیر ہوئی اور وہی پھیلاؤ اب تک جاری ہے۔''

اس وقت امریکہ کے خلائی ریسرچ کے ادارے NASA کے دو خلائی سٹیشنوں پر نصب دوربین (Hubble Space Telescope اور Spitzer Space Telescope)، Hubble کی دریافت پر مزید تحقیق میں مصروف ہیں اور کائنات کی توسیع کی رفتار کی پیمائش کر رہی ہیں۔ اس تحقیق کا ایک مقصد یہ معلوم کرنا بھی ہے کہ کیا کائنات ہمیشہ پھیلتی رہے گی یا ایک دن یہ توسیع رک جائے گی اور پھر الٹا عمل شروع ہو گا اور سب کچھ منہدم (Collapse) ہو جائے گا۔ (یعنی قیامت آ جائے گی)۔

۱۹۹۶ء میں ایک اور مشاہدہ سائنس دانوں کی حیرت کا باعث بنا اس سے پہلے ہمیشہ یہی سمجھا جاتا رہا کہ کیونکہ مادہ کشش ثقل کا باعث بنتا ہے اور یہ کشش اجسام کو اپنی جانب کھینچتی ہے اس لیے کائنات کی توسیع کی رفتار بتدریج کم ہونے کی توقع کی جاتی تھی۔ لیکن انتہائی دور دراز کہکشاؤں کے مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آئی ہے کہ یہ رفتار بتدریج بڑھ رہی ہے۔ کوئی ایسی قوت ہے جو نہ تو مادے کی طرح ہے اور نہ ہی عام توانائی جیسی، جو ان دور دراز کہکشاؤں کو مزید تیز رفتاری سے کائنات کے مرکز سے دور کرتی جا رہی ہے۔ اسے سائنس دانوں نے ''تاریک توانائی'' (Dark Energy) کا نام دیا ہے۔ اس لیے نہیں کہ یہ تاریک ہے بلکہ صرف اس لیے کہ یہ انسان کی سمجھ سے باہر کوئی قوت ہے جس پر انسانی عقل کوئی روشنی نہیں ڈال سکتی۔ (اسی کی خبر **انالموسعون** میں دی گئی ہے)۔

☆ زمین کو جاندار مخلوق کے لیے وضع (design) کیا گیا:

ہماری زمین ایک نظام شمسی کا حصہ ہے جس میں ایک سورج کے گرد ہماری زمین سمیت دس اجرام فلکی اپنے اپنے مدار میں گردش کر رہے ہیں اور یہ نظام شمسی ایک وسیع کہکشاں کے ایک کونے میں پڑا ہوا ہے جس میں اس جیسے اربوں نظام شمسی موجود ہیں اور ایسی اربوں کھربوں کہکشائیں مل کر Milky Way بنا ہے۔ لیکن اس Milky Way سے باہر بھی کہکشائیں موجود ہیں۔ اس طرح اس کائنات میں موجود اجرامِ فلکی جو ہمیں ستاروں اور سیاروں کی شکل میں نظر آتے ہیں کی تعداد لامحدود (Infinite) ہے۔ ہماری زمین کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس پر ایسے موسمی حالات اور اسباب موجود ہیں کہ یہاں جاندار مخلوق زندہ رہ سکتی ہے اور نشوونما پا سکتی ہے۔ یہ بات قرآن کریم میں اس طرح فرمائی گئی۔

''زمین کو ہم نے زندہ مخلوقات کے لیے وضع (Design) کیا۔''

(الرحمٰن ۱۰)

اس وقت تک سائنس دانوں نے ہمارے اس نظامِ شمسی میں موجود اور اس سے ماورا جن اجرامِ فلکی کا

مطالعہ کیا ہے اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہمارے قرب و جوار میں کوئی بھی سیارہ زمین جیسی خصوصیات کا حامل نہیں ہے جہاں کوئی جاندار مخلوق زندہ رہ سکے اور کائنات کے مطالعے سے اب تک جو اشارے ملے ہیں ان سے پتہ چلا ہے کہ ہماری زمین کی طرح کی کوئی اور زمینوں کے وجود کا امکان بہت کم ہے۔ لیکن قرآن کریم میں دو مقامات پر ہمیں یہ خبر دی گئی ہے کہ بالکل ایسی ہی زمینیں کائنات میں اور بھی موجود ہیں، متعلقہ آیات درج ذیل ہیں:

''اس کی نشانیوں میں سے ہے یہ زمین اور آسمانوں کی پیدائش، اور یہ جاندار مخلوقات جو اس نے دونوں جگہ پھیلا رکھی ہیں وہ جب چاہے انھیں اکٹھا کر سکتا ہے۔'' (الشوریٰ ۲۹)

''اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان بنائے اور زمین کی قسم سے بھی انہی کے مانند۔ ان کے درمیان حکم نازل ہوتا رہتا ہے۔ (یہ بات تمھیں اس لیے بتائی جا رہی ہے) تاکہ تم جان لو کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے اور یہ کہ اللہ کا علم ہر چیز پر محیط ہے۔'' (الطلاق ۱۲)

ان آیات سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ زندگی صرف زمین پر ہی نہیں پائی جاتی بلکہ دوسرے سیاروں میں بھی جاندار مخلوقات موجود ہیں اور یہ کہ ہماری زمین کی طرح کی اور زمینیں بھی اس کائنات میں موجود ہیں، یعنی ایسی زمینیں جن کو جاندار مخلوقات کے لیے ڈیزائن کیا گیا ہے۔ بالفاظ دیگر آسمان میں جو بے شمار ستارے اور سیارے نظر آتے ہیں ان میں سے بکثرت ایسے ہیں جن میں دنیائیں آباد ہیں۔

قدیم مفسرین میں سے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ ایسے مفسر ہیں جنھوں نے اس دور میں حقیقت کو بیان کیا تھا جب آدمی اس کا تصور تک کرنے کے لیے تیار نہ تھا کہ کائنات میں اس زمین کے سوا کہیں اور بھی ذی عقل مخلوق بستی ہے۔

بیہقی نے حضرت ابن عباسؓ کی یہ تفسیر اس طرح نقل کی ہے کہ (اس کائنات میں ہماری زمین کی طرح کی اور بھی زمینیں ہیں) ان میں سے ہر زمین میں نبی ہے تمھارے نبیؐ جیسا، اور آدم ہے تمھارے آدمؑ جیسا اور نوح ہے تمھارے نوحؑ جیسا اور ابراہیم ہے تمھارے ابراہیمؑ جیسا'' یعنی ہر زمین میں ایسے افراد پائے جاتے ہیں جو اپنے ہاں دوسروں کی نسبت اسی طرح ممتاز ہیں جس طرح ہمارے ہاں نوحؑ اور ابراہیمؑ ممتاز ہیں۔

آج اس زمانے میں سائنس دان اگرچہ اس بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کہہ سکتے کیونکہ جن قریبی سیاروں سے انھیں معلومات حاصل ہوتی ہیں وہاں زمین جیسی جاندار مخلوق کہیں موجود نہیں ہے لیکن وہ اس امکان کو رد بھی نہیں کر سکتے کہ اتنی وسیع کائنات میں زمین کی طرح کے اور اجرامِ فلکی بھی موجود ہیں جہاں ایسی ہی دنیائیں موجود ہیں۔ ۲۶ جولائی ۱۹۶۷ء کو

اکانومسٹ لندن میں ایک رپورٹ شائع ہوئی ہے جس کے مطابق مشہور ادارے Rand Corporation نے فلکی مشاہدات سے اندازہ لگایا ہے کہ زمین جس کہکشاں میں واقع ہے صرف اس کے اندر تقریباً ساٹھ کروڑ ایسے سیارے پائے جاتے ہیں جن کے طبعی حالات ہماری زمین سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں اور امکان ہے کہ ان کے اندر بھی جاندار مخلوق آباد ہو۔

☆ قیامت کی خبر:

قرآن میں سینکڑوں مقامات پر قیامت کے آنے کی خبر دی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ یہ کائنات جس میں ہم رہ رہے ہیں ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے۔ ایک دن یہ سارا نظام لپیٹ دیا جائے گا، یہ زمین، سورج، چاند، ستارے آسمان سب درہم برہم ہو جائیں گے اور اس کے بعد ایک نئی کائنات تخلیق کی جائے گی جو اس موجودہ کائنات سے مختلف ہوگی۔ اس کی خبر قرآن میں اس طرح دی گئی ہے۔

''جس دن اس زمین سے بدل دی جائے گی اور زمین اور بدل دیے جائیں گے آسمان، اور سب اللہ واحد القہار کے سامنے بے نقاب حاضر ہو جائیں گے۔'' (ابراہیم ۴۸)

جدید علم کائنات (Cosmology) کے مطابق کائنات کی تخلیق جو Big Bang سے شروع ہوئی، اس کے بعد سے یہ کائنات مسلسل وسعت پذیر ہے لیکن Expansion یا وسعت کا یہ سلسلہ ہمیشہ جاری نہیں رہے گا اور اس کا انجام Big Crunch کی صورت میں ظاہر ہوگا جب سب کچھ درہم برہم ہو جائے گا اور یہ واقعہ بغیر کسی پیشگی انتباہ (Warning) کے پیش آئے گا جیسے کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

''یہ لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ آخر وہ قیامت کی گھڑی کب نازل ہوگی؟ کہو! اس کا علم میرے رب ہی کے پاس ہے، اسے اپنے وقت پر وہی ظاہر کرے گا آسمانوں اور زمین پر وہ بڑا سخت وقت ہوگا اور وہ تم پر اچانک آجائے گا۔'' (اعراف ۱۸۷)

کائنات کی دوبارہ تخلیق کے بارے میں علم کائنات کے سائنس دانوں کا نظریہ وہی ہے جو اوپر سورہ ابراہیم کی آیت میں بیان کیا گیا ہے۔ ان کے خیال میں Big Crunch کے بعد Big Bang کی طرح کا ایک اور واقعہ رونما ہوگا جس کے نتیجے میں نئی کائنات وجود میں آئے گی، نئی زمین ہوگی نئے آسمان ہوں گے۔

☆ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات:

اس مضمون کی ابتدا اس بات سے ہوئی تھی کہ کفار قریش نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مطالبہ کرتے تھے کہ وہ بھی اپنی نبوت کے ثبوت میں اسی طرح کے معجزات لے کر آئیں جیسے کہ پہلے گزرے ہوئے بعض انبیاء لے کر آئے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے

انھیں یہ بتایا گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل معجزہ یہ قران کریم ہے جو آپؐ کی نبوت کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ لیکن اس موضوع پر بات کرتے ہوئے بات دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی۔ نبی کریمؐ کی ۲۳ سالہ نبوت کی زندگی میں آپ کے ہاتھوں سینکڑوں معجزات کا ظہور ہوا۔ یہ خرق عادت واقعات تھے جس نے لوگوں کو حیران کر دیا۔ یہ بات اس مضمون کی گنجائش سے باہر ہے کہ ان معجزات کا یہاں ذکر کیا جائے لیکن اب بھی بازار میں بیسیوں کتابیں دستیاب ہیں جن میں ان معجزات کو جمع کیا گیا ہے۔ لیکن آپؐ کا اصل معجزہ پھر بھی قرآن ہی تھا۔ (ختم شد)

(اس مضمون کی تیاری میں تفہیم القرآن، مشکوٰۃ شریف اور انٹرنیٹ سے مدد لی گئی)

❁❁❁

جادو سے حفاظت اور علاج

دورِحاضر میں کچھ لوگ خود کو ترقی یافتہ کہلانے کے شوق میں جادو سے صاف انکار کر دیتے ہیں کہ یہ سب محض افسانے ہیں لہٰذا فضول اور جہالت کی باتوں پر کان دھرنے کی ضرورت نہیں ہے جبکہ دوسری طرف ہمارے معاشرے کا ایک بڑا طبقہ جادو کے اثرات پر یقین رکھنے کے ساتھ ساتھ کئی قسم کی غیر شرعی باتوں اور توہمات میں مبتلا ہے۔ اس لیے قرآن وسنت کی روشنی میں جادو کی حقیقت کا جاننا ضروری ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے،''اور وہ اس چیز کے پیچھے لگ گئے جسے شیاطین سلیمان کی حکومت میں پڑھتے تھے۔ سلیمان نے تو کفر نہ کیا، بلکہ یہ کفر شیطانوں کا تھا، وہ لوگوں کو جادو سکھایا کرتے تھے۔''(البقرہ:۱۰۲)

مزید فرمایا،''موسیٰؑ نے کہا: کیا تم حق کے بارے میں جب وہ تمہارے پاس آیا، یہ کہتے ہو کہ یہ جادو ہے۔حالانکہ جادو گر کامیاب نہیں ہوا کرتے۔''(یونس:۷۷)

آگے ارشاد ہوتا ہے،''پھر جب انہوں نے ڈالا تو موسیٰ ؑ نے کہا کہ یہ جو کچھ تم لائے ہو جادو ہے۔''(یونس:۸۱)

اس کے علاوہ سورہ الفلق میں بھی جادو کے متعلق واضح الفاظ موجود ہیں۔حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبیؐ پر بھی یہودیوں نے بہت زور دار جادو کروایا تھا۔ لہٰذا بحیثیت مسلمان ہم جادو اور اس کے اثرات سے انکار نہیں کر سکتے۔امام نووی کہتے ہیں''اور صحیح یہ ہے کہ جادو حقیقتاً موجود ہے اور اسی موقف کو اکثر و بیشتر علما نے اختیار کیا ہے اور کتاب وسنت سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے۔''(فتح الباری جلد۱۰،صفحہ۲۲۲)

عربی میں جادو کو''سحر'' کہتے ہیں۔ امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں''سحر کا لفظ مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ اول،دھوکا اور بے حقیقت تخیلات پر بولا جاتا ہے۔''(مفردات القرآن)

تاج العروس میں ہے''سحر وہ عمل ہے جس میں پہلے شیطان کا قرب حاصل کیا جاتا ہے، پھر اس سے مدد لی جاتی ہے۔''

امام ابن قیم زاد المعاد میں لکھتے ہیں''جادو خبیث روحوں کے اثر ونفوذ سے مرکب ہوتا ہے۔اس سے انسانی طبیعتیں متاثر ہوتی ہیں۔'' وہ''طب نبویؐ''میں رقمطراز ہیں کہ''جادو کا پورے طور پر ان دلوں میں اثر ہوتا ہے جو کمزور اور اثر پذیر ہوتے ہیں یا ان شہوانی نفوس پر ہوتا ہے جن کا تعلق سفلیات سے ہوتا ہے۔'' مزید یہ کہ''روح

خبیثہ بھی ان ارواح کی جستجو میں رہتی ہیں جن میں ان خبیث روحوں کے تسلط کو قبول کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہوتی ہے۔'' (صفحہ ۱۵۴)

جادو سے حفاظت اور بچاؤ کے طریقے:

امام ابنِ قیم کے مطابق ''جادو و آسیب کا سب سے بہترین علاج اور دوا، آیات الٰہی (قرآن مجید)، بلکہ یہ بالذات نفع مند دوائیں ہیں۔ جادو چونکہ سفلی ارواح خبیثہ کے اثر سے ہوتا ہے اس لیے اس کے اثر کو اس سے ٹکر لینے اور مقابلہ کرنے والے اذکار اور ان آیات اور دعاؤں کے ذریعے سے ہی دور کیا جا سکتا ہے، جو اس کے عمل و اثر کو بالکل ختم کر دیں۔ یہ چیزیں جتنی ٹھوس اور قوی ہوں گی جادو اتارنے میں اتنی ہی مؤثر ثابت ہوں گی۔'' (زاد المعاد) ارشاد باری تعالیٰ ہے ''یہ قرآن جو ہم نازل کر رہے ہیں مومنوں کے لئے تو سراسر شفا اور رحمت ہے۔'' (بنی اسرائیل: ۸۲)

قرآن وسنت کی روشنی میں جادو سے بچاؤ اور علاج کے جو مشورے ہمیں ملتے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ عقیدے کی درستی:

عبداللہ بن محمد بن احمد رقمطراز ہیں کہ سب سے پہلے عقیدے کی درستی بے حد ضروری ہے یعنی اپنے دل و دماغ کو شرک جیسی غلاظت سے پاک کر کے صرف اور صرف ایک اللہ پر ایمان لانا، اسی کی عبادت کرنا، اسی پر بھروسہ کرنا اور یہ یقین رکھنا کہ ہر خیر و شر کا مالک صرف اللہ ہے اس کے حکم کے بغیر کوئی چیز ہمیں نفع و نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ جیسا کہ سورہ یونس میں ہے ''اگر اللہ آپ کو کوئی تکلیف پہنچائے تو سوائے اس کے اس کو دور کرنے والا بھی کوئی نہیں اور اگر فائدہ پہنچانا چاہے تو اس کی عنایت کو کوئی روک بھی نہیں سکتا، وہ اپنے بندوں میں جس کو چاہتا ہے نفع پہنچاتا ہے اور وہ بخشنے والا مہربان ہے۔'' (۱۰۷)

۲۔ قرآن وسنت کو مضبوطی سے تھامنا:

اس سلسلے میں ضروری ہے کہ قرآن کی تلاوت کو اپنا معمول بنایا جائے اور اس کے احکامات پر عمل کیا جائے یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم قرآن کو سمجھ کر پڑھیں اور اس پر غور کریں۔ ہر معاملے میں اللہ ہی سے ڈرنا اور اسی کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے'' اور جو اللہ سے ڈرے گا اللہ اس کے لئے چھٹکارے کی شکل نکال دے گا۔'' (الطلاق: ۲)

۳۔ نمازوں کی پابندی:

عبداللہ بن محمد بن احمد لکھتے ہیں کہ نماز شیطانی چالوں سے حفاظت کا ایک انتہائی مضبوط قلعہ ہے۔ قرآن وحدیث میں نماز کی بہت زیادہ تاکید ملتی ہے کیونکہ یہ اسلام کا بنیادی اور اہم رکن ہے حدیث میں ہے ''جس نے صبح کی نماز ادا کی وہ اللہ کی حفاظت میں ہو گیا، پس ابن آدم اس پر غور کرو کہ اللہ تمہاری حفاظت کے بدلے تم سے کسی چیز کا مطالبہ نہیں کر رہا ہے۔'' (مسند احمد)

۴۔صدقات وخیرات اور نیک کام کرنا:

حدیث میں ہے کہ ''صدقہ کرنے میں جلدی کیا کرو اس لیے کہ آفات ومصائب اسے پھلانگ نہیں سکتے اور یہ برائی کے ستر دروازوں کو بند کرتا ہے۔''(طبرانی کبیر)اس کے علاوہ خیر وبھلائی، دوسروں کی فلاح و بہبود کے کام کرنا اور نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرنا بھی اہم ہیں۔

۵۔طہارت کا اہتمام کرنا:

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جنات گندی جگہوں پر ڈیرہ ڈالتے ہیں۔حضرت زید بن ارقمؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا''یہ گندگی کی جگہیں شیاطین وجنات کے رہنے کی جگہیں ہیں پس جب تم میں کوئی قضائے حاجت کو جائے تو(یہ) کہہ لیا کرے:اے اللہ! میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں شریر جنوں اور جنیوں سے۔''(ابوداؤد)

امام جلال الدین سیوطیؒ''تاریخِ جنات وشیاطین ''میں لکھتے ہیں کہ عمومی طور پر جنات کی جگہیں نجاست والے مقامات ہوتے ہیں جیسے گندگی کے ڈھیر اور حمامات، اسی وجہ سے حمام میں اور اونٹوں کے بیٹھنے کی جگہوں وغیرہ پر نماز ادا کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ظاہر ہے اگر شیاطین کا مسکن گندگی پر ہے اور جادو میں بھی نجس اشیاء کا استعمال ہوتا ہے تو ان سے حفاظت کے لئے طہارت کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اسلام میں طہارت کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور زیادہ تر عبادات کا انحصار طہارت اور پاکیزگی پر مبنی ہے۔آپ ﷺ پر جو دوسری وحی نازل ہوئی اس میں ایک ہدایت یہ تھی''اے نبیؐ!اپنے کپڑے صاف رکھیئے اور گندگی سے دور رہیے۔''(المدثر:۴۔۵)

بقول اقبال کیلانی''دین اسلام کا پہلا سبق ہی طہارت ہے۔ جب کوئی غیر مسلم دائرہ اسلام میں داخل ہوتا ہے تو سب سے پہلے اسے غسل کر کے طہارت حاصل کرنا ہوتی ہے اس کے بعد وہ کلمہ شہادت کا اقرار کر کے مسلمان کہلاتا ہے۔''(طہارت کے مسائل:٦)

مطالعہ حیات طیبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ صفائی و پاکیزگی کو بہت اہمیت دیتے تھے۔آپ ﷺ کا ارشاد ہے''صفائی نصف ایمان ہے۔''(صحیح مسلم)اور یہ کہ''نماز کی چابی طہارت(وضو) ہے۔''(ابوداؤد)۔ لہٰذا اپنے جسم لباس اور گھروں کو صاف رکھنے کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے شہروں اور ملک کو بھی صاف رکھنے کے اقدام کرنے چاہئیں۔ اسلام ظاہری صفائی کے علاوہ باطنی پاکیزگی پر بھی زور دیتا ہے۔ارشاد ہوتا ہے''بیشک اللہ بہت توبہ کرنے والوں اور پاکیزگی حاصل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''(البقرہ:۲۲۲)

ابوبکر الجزائری کے مطابق باطنی پاکیزگی دراصل''نفس کو گناہ اور نافرمانی کے آثار سے پاک وصاف رکھنا ہے۔اس کے لیے گناہوں اور نافرمانیوں سے سچی توبہ کی ضرورت ہوتی ہے۔''جبکہ ظاہری طہارت ''پلید چیزوں اور ناپاکی سے صاف رہنا ہے۔''(منہاج

المسلم:۲۹۴)۔ اس سلسلے میں ہر وقت باوضو رہنا ایک بہترین عمل ہوسکتا ہے۔

۶۔گھر کو تصاویر اور مجسموں سے پاک رکھنا:

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جس گھر میں تصویر اور مجسمے ہوتے ہیں اس میں فرشتے داخل نہیں ہوتے۔'' (مسلم) ظاہر ہے جس گھر میں فرشتے داخل نہیں ہوتے تو پھر وہاں شیطانوں کا بسیرا ہی ہوسکتا ہے۔

۷۔مسنون آیات اور دعاؤں سے علاج:

حدیث سے کچھ مسنون اذکار کے بارے میں معلوم ہوتا ہے جن کو روزانہ پڑھنا، جادو سے بچاؤ اور علاج کے لئے اکسیر ہے۔ان میں سے چند ایک کا ذکر درج ذیل ہے۔

(الف) سورہ بقرہ کی تلاوت: جس گھر میں سورہ بقرہ کی تلاوت کی جاتی ہے وہاں سے شیطان بھاگ جاتا ہے۔ خاص کر اس کی آخری دو آیات کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ: جس گھر میں تین راتوں تک یہ دو آیات پڑھی جائیں تو شیطان اس گھر کے قریب سے بھی نہیں گزرتا۔'' (ترمذی)

(ب) آیت الکرسی، سورہ اخلاص اور معوذتین کا کثرت سے ورد، خاص طور پر فرض نمازوں کے بعد اور سونے سے پہلے ان تمام سورتوں کو پڑھنا بے حد فائدے مند ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص اپنے بستر پر لیٹتے وقت آیت الکرسی پڑھ لے تو اللہ تو تعالیٰ کی طرف سے ایک فرشتہ مقرر کر دیا جاتا ہے جو رات بھر اس کی حفاظت کرتا ہے اور صبح تک اس کے پاس شیطان نہیں آتا۔'' سورہ اخلاص اور معوذتین کا پڑھنا انسان کو جنات اور شیاطین کے شر سے محفوظ رکھتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن خبیبؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: صبح وشام سورہ اخلاص اور معوذتین (سورہ الفلق اور سورہ الناس) پڑھو، یہ تمہارے لیے ہر چیز سے کافی ہوں گی۔'' (ترمذی) ان کے علاوہ گھر میں، باتھ روم میں داخل ہونے کی مسنون دعائیں اور صبح وشام کے اذکار بھی فائدہ مند ہوتے ہیں۔

۸۔قدرتی دوائیں:

قرآن وسنت سے ہمیں کھانے پینے کی بہت سی ایسی اشیاء کا معلوم ہوتا ہے جن کے استعمال سے باذن اللہ شفا کا حصول ممکن ہے ان میں چند ایک درج ذیل ہیں:

(۱) شہد: اللہ تعالیٰ نے شہد کو ''شفاء للنّاس'' کہا ہے حدیث میں ہے ''تین چیزوں میں شفا ہے شہد کا گھونٹ پینا، سینگی لگوانا، آگ سے داغنا، لیکن میں اپنی امت کو آگ سے داغنے سے منع کرتا ہوں۔'' (بخاری)

(۲) کلونجی: نبی کریمؐ نے فرمایا ''سیاہ دانہ یعنی کلونجی ضرور استعمال کرو، کیونکہ اس میں موت کے علاوہ تمام بیماریوں کی شفا موجود ہے۔'' (بخاری)

(۳) آب زم زم اور بارش کا پانی: آپؐ نے فرمایا: روئے زمین پر سب سے عمدہ پانی آب زم زم ہے اس میں غذائیت اور شفا ہے۔'' (صحیح الجامع الصغیر) ابن قیمؒ فرماتے ہیں ''میں اور میرے علاوہ دیگر لوگوں نے آب زم زم کو بطور شفا آزمایا ہے اور مجھے باذن اللہ آب زم زم کے ذریعے متعدد امراض سے نجات مل گئی ہے۔'' بارش کے پانی کے متعلق فرمان الٰہی ہے ''اور ہم نے آسمان سے برکت والا پانی اتارا۔'' (ق:۹)

(۴) خوشبو کا استعمال: ہمارے ہاں عام طور پر یہ خیال پایا جاتا ہے کہ خوشبو لگانے سے جنات کے چمٹنے کے امکان ہوتے ہیں جب کہ معلوم ہوتا ہے کہ خوشبو کا استعمال جنوں کو بھگانے میں بہت اہم ہے۔ امام ابن قیمؒ طب نبویؐ میں رقمطراز ہیں کہ عمدہ خوشبو روح کو غذا مہیا کرتی ہے، قلب وذہن اور اعضائے باطنہ کو قوت بخشتی ہے، قلب وجگر اور روح کو فرحت اور انبساط مہیا کرتی ہے اور روح کے لئے بہت مفید ونفع بخش ہے۔ وہ مزید لکھتے ہیں ''خوشبو کی ایک خاصیت یہ ہے کہ فرشتے اسے پسند کرتے ہیں اور شیاطین اس سے نفرت کرتے ہیں، انہیں بدبودار مکروہ چیزیں محبوب ہوتی ہیں۔'' (صفحہ ۴۳۷)

امام شافعی کے مطابق بدن کو قوت بخشنے والی چار چیزوں میں سے ایک خوشبو سونگھنا ہے۔ نبی کریمؐ کثرت سے خوشبو استعمال فرماتے، بدبودار اور مکروہ چیزیں آپ کی طبیعت پر ناگوار گزرتی تھیں۔ آپؐ کی دو دنیاوی محبوب ترین چیزوں میں سے ایک خوشبو ہے۔ لہٰذا سنت کے مطابق خوشبو کا استعمال کریں۔ آپؐ کا ارشاد ہے ''ہر مسلمان پر اللہ تعالیٰ کا ایک حق یہ ہے کہ وہ ہر سات دن میں غسل کرے اور اگر خوشبو میسر ہو تو اسے بھی لگائے۔'' (ابن حبان) آپؐ کبھی بھی خوشبو (کا تحفہ) واپس نہ فرماتے تھے۔ (بخاری)

آپؐ فرماتے ''جس شخص کو تحفے میں پھول پیش کیا جائے وہ اسے واپس نہ کرے، کیونکہ وہ اٹھانے میں ہلکا اور عمدہ خوشبو والا ہے۔'' (مسلم)

جادو کے علاج کے سلسلے میں آخری اور اہم بات یہ ہے کہ کبھی بھی جادو کا علاج جادو سے نہ کرنا چاہیے۔ آپؐ کا ارشاد ہے ''جس نے تھوڑا یا زیادہ جادو سیکھا اس کا معاملہ اللہ کے ساتھ ختم ہوا'' اس لیے علما کے نزدیک یہ ایک کفریہ اور شرکیہ عمل ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی حفاظت میں رکھے آمین۔

☆☆☆

ڈاکٹر نثار احمد چیمہ

بنگلہ دیش کا سفر
تاریخی پسِ منظر میں

ماضی کے مشرقی پاکستان کی سیاحت کا حال، ہجر و وصال کی ان کیفیات کے ساتھ جو ایک پاکستانی ہی محسوس کر سکتا ہے

ڈھاکہ مسجدوں کا شہر بھی کہلاتا ہے۔ یہاں کی سب سے بڑی اور تاریخی مسجد بیت المکرّم ہے، جس میں نماز پڑھنے کی خواہش مُدت سے تھی۔ 4 مئی 2012ء کو جمعۃ المبارک تھا۔ جمعہ کی نماز کے لیے ڈاکٹر ظفر اکرام، ڈاکٹر اختر رشید، ڈاکٹر طاہر منظور اور میں کچھ دیگر ساتھیوں کے ساتھ ڈاکٹر معظم حسین کی رہنمائی میں مسجد بیت المکرّم میں داخل ہوئے، تو ابھی خطبہ شروع نہیں ہوا تھا۔ نمازی بہت بڑی تعداد میں جوق در جوق مسجد کی طرف امڈے چلے آ رہے تھے۔ ہماری خواہش پر ڈاکٹر معظم حسین ہمیں امام صاحب کے حُجرے میں لے گئے۔ امام صاحب کو جب پتہ چلا کہ ہم پاکستان سے آئے ہیں تو وہ بہت خوش ہوئے، اور بڑی گرم جوشی سے ملے۔

جب میں نے ان سے کہا: ''ہم آپ کے لیے اور بنگلہ دیش کے مسلمانوں کے لیے پاکستان سے سلام اور محبت کا پیغام لے کر آئے ہیں'' تو انھوں نے کہا: ''ملت اسلامیہ ایک جسم کی طرح ہیں اور ہم سب مسلمان ایک ہی جسم کے حصے ہیں۔'' اس پر میرے منہ سے بے اختیار نکلا کہ: ''امام صاحب، ساری دنیا کے مسلمان ایک جسم کے حصے ہیں، مگر بنگلہ دیش اور پاکستان تو ایک دل کے دو ٹکڑے ہیں۔'' جس پر امام صاحب نے بڑی محبت سے میرا ہاتھ تھام کر کہا: ''آپ نے بالکل صحیح کہا، واقعی ایسا ہی ہے۔''

مسجد بیت المکرّم میں نماز کے لیے میں سوچ سمجھ کر جناح کیپ پہن کر گیا تھا، جس سے پاکستانی کے طور پر میری شناخت دُور سے ہو جاتی تھی۔ مسجد بیت المکرّم میں جس شخص کی نظر بھی جناح کیپ پر پڑی، اُس نے بڑی محبت اور اپنائیت سے مجھے دیکھا۔ کتنے ہی لوگ روک کر مجھے ملتے رہے، اور زبان سے کچھ بھی کہے بغیر، نہ جانے کیا کچھ کہتے رہے۔

بنگلہ دیش کے پارلیمنٹ ہاؤس کی عمارت غالباً ڈھاکہ کی سب سے خوبصورت عمارت ہے۔ فنِ تعمیر کی شاہکار یہ عمارت پانی میں تیرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس عمارت کی تعمیر کا آغاز صدر ایوب خان کے زمانے میں ہوا تھا۔ مگر اس کی تکمیل بنگلہ دیش بننے کے بعد ہوئی۔

پارلیمنٹ ہاؤس کے پاس ہی واقع وسیع و عریض

پارک میں بنگلہ دیش کے سابق صدر جنرل ضیاء الرحمٰن مرحوم جو بنگلہ دیش نیشنلسٹ پارٹی کی موجودہ سربراہ اور سابق وزیر اعظم بیگم خالدہ ضیاء کے شوہر تھے، ان کا مزار ہے۔ ہم بھی وہاں فاتحہ کے لیے گئے، جنرل ضیاء الرحمٰن مرحوم اب بھی بنگلہ دیش میں کافی مقبول ہیں۔

دھان منڈی کے علاقے میں واقع بنگلہ دیش کے بانی اور پہلے صدر شیخ مجیب الرحمٰن کا وہ گھر بھی دیکھا، جہاں شیخ مجیب الرحمٰن کو بنگلہ دیش کی فوج کے کچھ نوجوان افسروں نے اہل خانہ سمیت قتل کر دیا تھا۔ موجودہ وزیر اعظم حسینہ واجد، مجیب الرحمٰن کے اہل خانہ اور اولاد میں سے واحد بیٹی تھیں، جو اس وقت بیرون ملک ہونے کی وجہ سے بچ گئی تھیں۔ شیخ مجیب الرحمٰن کی اس رہائش گاہ کو اب ایک میوزیم بنا دیا گیا ہے۔

تحریک پاکستان کے عظیم بنگالی رہنماؤں، شیر بنگال اے کے فضل الحق (جنھیں وہاں شیر بنگلہ کہتے ہیں)، حسین شہید سہروردی اور خواجہ ناظم الدین کی قبروں پر حاضر ہوئے تو دل اور جذبات کی عجب کیفیت تھی۔ ان تینوں رہنماؤں کی قبریں ایک ہی چبوترے پر ایک ہی چھت کے نیچے واقع ہیں۔

شیر بنگال کی قبر کے سرہانے کھڑے کھڑے چشم تصور مجھے 72 سال پیچھے لاہور کے منٹو پارک میں لے گئی، جہاں 23 مارچ 1940ء کو مسلمانان برصغیر کی نمائندہ جماعت کل ہند مسلم لیگ کے سربراہ قائداعظم محمد علی جناح کی صدارت میں ہونے والے تاریخی اجلاس میں شیر بنگال وہ تاریخ ساز قرارداد لاہور پیش کر رہے تھے (جو بعد میں قرارداد پاکستان کہلائی) جس نے مسلمانان برصغیر کے مستقبل کا فیصلہ حتمی طور پر کر دیا۔

شیر بنگال نے جب اپنی قرارداد میں دو قومی نظریئے کی بنیاد پر مسلمانان برصغیر کے لیے ان کے اکثریتی علاقوں پر مشتمل ایک الگ وطن کا مطالبہ کیا، تو برصغیر کے تمام صوبوں سے آئے ہوئے کل ہند مسلم لیگ کے راہنماؤں نے باری باری پُر جوش انداز میں اس قرارداد کی تائید کی۔ پھر چشم تصور مجھے تحریک پاکستان کے دور کے ڈھاکہ اور مسلم بنگال میں لے گئی، جہاں کے گلی کُوچے پاکستان زندہ باد، قائدہ اعظم زندہ باد اور پاکستانیر مطلب کیہ (پاکستان کا مطلب کیا) لاالٰہ اِلااللہ کے فلک شگاف نعروں سے گونج رہے تھے۔

1906ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد بھی اسی شہر ڈھاکہ میں رکھی گئی تھی۔ قرارداد پاکستان بھی بنگال کے شیر نے پیش کی تھی۔ تحریک پاکستان میں بھی مسلم بنگال ہی سب سے آگے تھا۔ 1946ء کے فیصلہ کن الیکشن میں کل ہند مسلم لیگ کو سب سے زیادہ کامیابی بھی مسلم بنگال ہی میں حاصل ہوئی۔ بنگالی مسلمان ہم سے زیادہ باشعور اور متحرک تھے اور ہم سے اچھے مسلمان تھے۔ ہم سے زیادہ محبّ وطن پاکستانی تھے۔ مگر مغربی پاکستان

کے زیادہ تر حکمرانوں اور افسروں کا رویہ مشرقی پاکستان کے خوددار لوگوں کے ساتھ عام طور پر تضحیک آمیز رہا، جو ان کی عزتِ نفس کو مجروح کرتے رہے اور ان کے جائز حقوق دینے میں بھی پس وپیش کرتے رہے۔ نتیجہ یہ کہ مشرقی پاکستان کے عوام کا احساس محرومی بڑھتا گیا۔ غیر جمہوری اور فوجی ادوار میں اس احساس محرومی میں مزید اضافہ ہوا، جسے وہاں کی کچھ سیاسی پارٹیوں اور لیڈروں نے بھی ایکسپلائیٹ کیا۔ اس بدنما صورت حال میں دشمن ملک کو سہولت میسر آئی کہ وہ ہماری وحدت کم زور کرنے کے لیے اپنے شیطانی منصوبے کو آگے بڑھائے۔

1970ء کے عام انتخابات میں عوامی لیگ، شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کے چھ نکات کی غیر معمولی پذیرائی اور کامیابی مشرقی پاکستان کے عوام کے غیر معمولی احساس محرومی کا غیر معمولی ردعمل تھا۔ جسے صدر یحییٰ خان جیسے اور نا عاقبت اندیش حکمران اور اس کے حواریوں نے فوجی ایکشن کے ذریعے بنگالیوں کی جنگ آزادی میں بدل دیا۔ اسی فوجی ایکشن پر حبیب جالب کے یہ اشعار صورتِ حال کی کس قدر درست عکاسی کر رہے تھے:

محبت گولیوں سے بو رہے ہو
وطن کا چہرہ خوں سے دھو رہے ہو
گماں تم کو کہ رستہ کٹ رہا ہے
یقیں مجھ کو کہ منزل کھو رہے ہو

اس صورتِ حال سے توقع کے عین مطابق بھارت نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ عوامی لیگ اور اس کے حلیفوں کے نوجوانوں کو آزادی کے نام پر مکتی باہنی کے پلیٹ فارم پر منظّم کیا۔ انھیں فوجی ٹریننگ اور اسلحہ فراہم کیا۔ مکتی باہنی کے تربیت یافتہ مسلح جتھے، پاک فوج کیخلاف گوریلا کاروائیاں کرتے رہے اور انھوں نے غیر بنگالیوں اور پاکستان کے حامی بنگالیوں کے قتل عام میں بھی کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔

پاکستان کی تاریخ کا یہ بدقسمت ترین باب میرے سامنے کھلا پڑا تھا اور میں چشم تصور سے دیکھ رہا تھا کہ 1970ء کے عام انتخابات میں مشرقی پاکستان کی قومی اسمبلی کی 162 نشستوں میں 160 نشستیں عوامی لیگ جیت چکی تھی (یہاں میں اس پہلو پر بحث نہیں کر رہا کہ یوم انتخاب عوامی لیگ کو کس طرح کی آزادی میسر تھی اور وہ بھی مکمل طور پر یک طرفہ)۔ جبکہ مغربی پاکستان چار صوبوں کی 148 نشستوں میں سے 88 نشستوں پر پیپلز پاٹی کامیاب ہوئی تھی۔

اس طرح 300 نشستوں کے ایوان میں عوامی لیگ 160 نشستوں کے ساتھ واضح اکثریت حاصل کر چکی تھی۔ مگر یحییٰ خان، اُس کے حواری اور پیپلز پارٹی اسے اقتدار منتقل کرنے میں ہچکچاہٹ کا شکار تھے۔ جب انتقال اقتدار کے لیے نومنتخب قومی اسمبلی کا پہلا اجلاس

ڈھاکہ میں بلایا گیا تو پیپلز پارٹی کے قائد ذوالفقار علی بھٹو نے شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ شراکت اقتدار کے معاملات طے نہ پا سکنے کے بعد یہ دھمکی دے دی کہ مغربی پاکستان سے جو ممبر قومی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لیے ڈھاکہ جائے گا، اس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی۔

اس کے بعد صدر یحییٰ خان نے قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی کر دیا۔ یوں مشرقی پاکستان کے لوگوں کو یہ واضح پیغام دے دیا کہ الیکشن جیتنے اور قومی اسمبلی میں واضح اکثریت حاصل کر لینے کے باوجود ان کے منتخب نمائندوں کو اقتدار منتقل نہیں کیا جائے گا۔ یکم مارچ کو قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی ہونے پر مشرقی پاکستان میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ جس کے بعد 7 مارچ کو شیخ مجیب الرحمٰن نے ڈھاکہ میں بہت بڑے احتجاجی جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے سول نافرمانی کا اعلان کر دیا۔

اس کے بعد یحییٰ خان اور اس کے ٹولے نے ایک بار پھر شیخ مجیب الرحمٰن سے مذاکرات کا ڈھونگ رچانے کی کوشش کی، مگر شیخ مجیب الرحمٰن کا مطالبہ یہ تھا کہ سب سے پہلے قومی اسمبلی کا اجلاس بلانے کا اعلان کیا جائے اور پھر 25 مارچ 1971ء کی وہ بدقسمت گھڑی آن پہنچی، جب مجبوراً مشرقی پاکستان میں فوجی آپریشن شروع کر دیا گیا۔ وہاں اپنے ہی عوام کے خلاف جنگ کی کیفیت پیدا کر دی گئی۔ اس جنگ میں جسے یحییٰ خان اور اس کے حواریوں نے اپنی حماقتوں سے بنگالیوں کی جنگ آزادی بنا دیا۔

مشرقی پاکستان کے کتنے ہی دین دار اور ہر حال میں پاکستان کی سلامتی اور یکجہتی کو قائم رکھنے کے آرزومند گھرانوں کے بنگالی نوجوانوں نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر پاک فوج کا ساتھ دیا اور پاکستان کو یک جا رکھنے کی خاطر بے پناہ قربانیاں دیں۔ جس کا خمیازہ ان میں سے بھارتی فوج اور مکتی باہنی کے ہاتھوں بچ جانے والے اور ان کے بزرگ، بنگلہ دیش میں غداری کی تہمتیں لیے آج تک بُھگت رہے ہیں۔ جماعت اسلامی بنگلہ دیش کے بزرگ راہنما پروفیسر غلام اعظم کے خلاف چالیس سال گزرنے کے بعد پاکستانی فوج کا ساتھ دینے اور جنگی جرائم کا مرتکب ہونے کے ناروا اور بدنیتی پر مبنی الزامات کی بنیاد پر حالیہ مقدمات چلائے جا رہے ہیں۔ بنگلہ دیش میں جب بھی عوامی لیگ کی حکومت آتی ہے، 1971ء میں پاکستانی فوج کا ساتھ دینے والوں کو ہراساں اور تنگ کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا جاتا ہے۔

نومنتخب قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی کرنے اور پھر 25 مارچ 1971ء کو مشرقی پاکستان میں فوجی ایکشن شروع کرنے کا عمل، بالآخر ہندوستان کی براہ راست فوجی مداخلت کے بعد 16 دسمبر 1971ء پہ منتج ہوا اور ہمارا پیارا مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا۔

تحریک پاکستان کے دوران مسلم بنگال کے قومی رہنماؤں کے کیا خواب تھے، کیا تصورات تھے، کیا ارما ن تھے اور پھر کس طرح ان ارمانوں کا خون ہوتا رہا۔ اوراس خون سے کیسے ہولناک نتائج برآمد ہوئے۔ آج میں شیر بنگال اے کے فضل الحق، حسین شہید سہروردی اورخواجہ ناظم الدین کی قبروں کے سامنے حسرت کی تصو یر بنا، ایک مُجرم کی طرح سر جھکائے کھڑا یہ سوچ رہا تھا:

کاش، 1970ء کے عام انتخابات کے نتائج کو تسلیم کرتے ہوئے اقتدارعوامی لیگ کومنتقل کردیا جاتا۔ کاش، ذوالفقارعلی بھٹو غیر مشروط طور پر اپوزیشن میں بیٹھنے پر تیار ہوجاتے۔ کاش، قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی نہ کیا جاتا۔ کاش، مشرقی پاکستان میں فوجی ایکشن نہ کیا جاتا۔

ہماری تاریخ، کاش اور حسرتوں سے بھری پڑی ہے۔ ہم نے اپنا آدھا مُلک گنوا کر بھی کوئی سبق نہیں سیکھا۔ 1971ء پاکستان دولخت ہونے کے بعد باقی ماندہ ملک میں بھی ایسے فیصلے ہوتے رہے، جنہوں نے مُلک کو نا قابل تلافی نقصان پہنچایا اور جن کے بارے میں بھی ایک عام پاکستانی حسرت کے ساتھ یہی سوچتا ہے کہ کاش ایسا نہ ہوتا۔

کاش، ذوالفقارعلی بھٹو 1977ء کے متنازع الیکشن کے فوراً بعد نئے الیکشن کرانے پر رضامند ہوجاتے۔ کاش، ذوالفقارعلی بھٹو کو پھانسی نہ دی جاتی۔ کاش، پرویز مشرف کو آرمی چیف نہ بنایا جاتا۔ کاش، وہ 12 اکتوبر 1999ء کو منتخب جمہوری حکومت کا تختہ اُلٹ کر اقتدار پر مسلط نہ ہوجاتا۔ کاش، 9/11 کے بعد پاکستان پر مسلط فوجی حکمران پرویز مشرف اپنے افغان مسلمان بھائیوں کے خلاف امریکی حملہ آوروں کے ساتھ نہ دیتا۔ کاش لال مسجد پر حملہ کرکے قرآن پڑھتی معصوم بچیوں کو شہید نہ کیا جاتا۔

کاش، قبائلی علاقوں میں فوج نہ بھیجی جاتی۔ کاش، اپنے ہی لوگوں کے خلاف فوجی کارروائی نہ ہوتی۔ کاش، اپنے لوگوں کو پکڑ کر ڈالروں کی خاطر امریکہ کے حوالے نہ کیا جاتا۔ کاش بلوچستان میں فوجی ایکشن نہ ہوتے، کاش اکبر بگٹی کا خون نہ کیا جاتا۔ اے کاش اور حسرتوں کا یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے اور نہ جانے کب تک جاری رہے گا۔

بنگلہ دیش کے بالخصوص نوجوان اپنی آزادی کا ذکر فخر کے ساتھ کرتے ہیں۔ وہ 1971ء کے تکلیف دہ مراحل اور زخموں کے وہ تذکرے، جواب ان کے تعلیمی نصاب میں شامل ہیں، ان کی بنیاد پر اکثر اوقات بڑے کرب، رنج اور کسی قدر تلخی کے ساتھ تذکرہ کرتے ہیں۔ مگر پھر بنگلہ دیشی بھائیوں کے زخمی دلوں کے کسی گوشے میں سوئی ہوئی پاکستان سے محبت انگڑائی لیتی ضرور دکھائی دیتی ہے، جس کا اظہار بھی واضح طور پر ہوجاتا ہے۔

ہمارے بنگالی دوست ڈاکٹر معظم نے ڈھاکہ

یونیورسٹی کے پاس سے گزرتے ہوئے کئی المناک واقعات اور داستانیں سنانے کے بعد کہا: ''یہ واقعات صحیح ہیں، یہ سب اسی طرح ہوا تھا مگر بھائی، ہم کیا کریں، دل سے بے اختیار یہی آواز اُٹھتی ہے دل دل پاکستان، جان جان پاکستان۔''

ڈاکٹر اسیر الدین 1971ء کے تکلیف دہ واقعات کا ذکر کرتے ہوئے کہہ رہے تھے: ''میں اس وقت صرف سات سال کا بچہ تھا، مگر مجھے یاد ہے کہ فوجی ایکشن شروع ہونے کے بعد میرے والدین بہت پریشان تھے۔ وہ بتاتے تھے کہ شہروں میں کھانے پینے کی اشیا نہیں پہنچ رہیں، ان کی قلت ہوگئی ہے۔ ہمارے گھر میں نہ کھانے کو کچھ تھا اور نہ پینے کو۔

ڈاکٹر اسیر الدین اس دور کے واقعات اور اپنے گھر کے تکلیف دہ حالات کا ذکر کرتے ہوئے بہت غمگین اور رنجیدہ ہو گئے، مگر پھر جب آبدیدہ ہو کر انھوں نے کہا: ''نثار بھائی، ہم اُن واقعات کو، اُس سب کچھ کو بھول جانا چاہتے ہیں، ہم اپنے پاکستانی بھائیوں کے چہروں پر مسکراہٹ دیکھنا چاہتے ہیں۔'' تو یہ سن کر میں بھی اپنے آنسو ضبط نہ کر سکا۔

بنگلہ دیش کے عوام کی جنگ میں ہندوستان تو ان کا مددگار اور محسن تھا، جبکہ پاکستانی فوج سے لڑ کر انھوں نے آزادی حاصل کی۔ مگر ڈھاکہ میں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان ہونے والے کسی بھی میچ میں دنیا حیرت کے ساتھ یہ منظر دیکھتی ہے کہ بنگلہ دیشی تماشائیوں کی غالب اکثریت کی ہمدردیاں واضح طور پر پاکستان کے ساتھ ہوتی ہیں۔ بنگلہ دیشی بھائیوں کی پاکستان کے لیے غیر معمولی ہمدردیوں اور جوش و خروش کی بنا پر تماشائیوں کا ہجوم پاکستانی ٹیم کے لیے Home Crowd اور ہندوستان کے لیے Hostile Crowd بن جاتا ہے۔

سقوط مشرقی پاکستان کے موقع پر ہندوستان کی اس وقت کی وزیر اعظم اندرا گاندھی نے فاتحانہ اور فخریہ انداز میں کہا تھا کہ: ''آج ہم نے دوقومی نظریہ خلیج بنگال میں غرق کر دیا ہے۔'' نہیں، ہرگز نہیں۔ مشرقی پاکستان ہماری غلطیوں اور ناعاقبت اندیشیوں کی وجہ سے بنگلہ دیش ضرور بن گیا، مگر اس سرزمین پر دوقومی نظریہ پوری آب و تاب سے آج بھی زندہ ہے۔

مسجد بیت المکرّم اور بنگلہ دیش کے ہر شہر، ہر گاؤں، ہر قریہ سے ہر روز پانچ مرتبہ جب اللہ اکبر کی صدا بلند ہوتی، اور جب یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ **اشھدُ ان لااِلہ الا اللہ اشھد ان محمدً رسول اللہ** تو یہ اس بات کا اعلان ہوتا ہے کہ ہمارا تعلق قومِ رسول ہاشمی ﷺ سے ہے۔ یہ صدا اور یہ اعلان درحقیقت دو قومی نظریہ کے زندہ جاوید ہونے کا اعلان ہے۔ بنگلہ دیش کی فضاؤں میں جب تک یہ صدائیں گونجتی رہیں گی دوقومی نظریہ بھی زندہ رہے گا۔

مسلم بنگال کا نام مشرقی پاکستان کے بجائے بنگلہ دیش تو رکھ دیا گیا، مگر مشرقی پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جو سرحدی لکیر 14 اگست 1947ء کو دو قومی نظریے کی بنیاد پر کھینچی گئی تھی، وہی لکیر آج بھی بنگلہ دیش اور ہندوستان کے درمیان سرحد کی شکل میں موجود ہے۔ بنگلہ دیش اور ہندستان کے درمیان اس سرحدی لکیر کے ساتھ ساتھ دونوں طرف بسنے والے ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے ہیں، ایک ہی زبان بولتے ہیں، ان کی ثقافت کے کئی پہلو بھی بظاہر مشترک ہیں، مگر دوقومی نظریہ کی بنیاد پر کھینچی جانے والی یہ لکیر اس بات کا اعلان کر رہی ہے کہ اس لکیر کے دونوں طرف دو مختلف قومیں بستی ہیں۔

جب تک مسلم بنگال اور بھارتی بنگال کے درمیان 14 اگست 1947ء کو دوقومی نظریے کی بنیاد پر کھینچی جانے والی سرحدی لکیر بنگلہ دیش اور بھارت کے درمیان سرحد کی شکل میں موجود ہے، اور اِن شاء اللہ قیامت تک موجود رہے گی، دوقومی نظریہ بھی زندہ رہے گا۔

بنگلہ دیش میں دوقومی نظریے کا پوری قوت کے ساتھ زندہ رہنے کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے کہ پاکستان (جس کی فوج سے لڑ کر انھوں نے آزادی حاصل کی) اور ہندوستان (جو ان کے بقول جنگ آزادی میں ان کا مددگار تھا) کے درمیان ہونے والے میچوں میں بنگلہ دیشی تماشائیوں کا ہجوم اپنی تمام تر ہمدردیوں اور جوش وخروش کے ساتھ پاکستانی ٹیم کے لیے Home Crowd بن جاتا ہے۔

کچھ عرصہ پہلے پاکستان اور بنگلہ دیش کے درمیان ڈھاکہ میں ہونے والے کرکٹ میچ میں پاکستان کی جیت پر پاکستان مسلم لیگ کے صدر میاں محمد نواز شریف نے کہا تھا: ''میں یہ میچ بڑی دلچسپی کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ جب جیت ہار کا فیصلہ ہوا تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کسے مبارک باد دوں اور کس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کروں، ایسے لگتا تھا، جیسے دونوں طرف ہم خود ہی ہیں۔''

اس خوبصورت تبصرے میں پوری قوم کے جذبات کی عکاسی تھی۔ میں نے میاں نواز شریف کا یہ تبصرہ بنگلہ دیش میں کئی جگہوں پر سنایا۔ جس نے بھی یہ تبصرہ سنا، وہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

6 مئی کو ہماری کانفرنس ختم ہوئی۔ 7 مئی کو ہم تین ساتھی ڈاکٹر ظفر اکرام، ڈاکٹر اختر رشید اور میں سلہٹ جانے کا پروگرام بنا چکے تھے، اور اس مقصد کے لیے ٹیکسی کے طور پر چلائی جانے والی ایک کار کے ڈرائیور سے بات بھی ہوچکی تھی۔ چنانچہ اس روز ہم صبح آٹھ بجے کے قریب ڈھاکہ سے سلہٹ کے لیے روانہ ہوئے۔

بنگلہ دیش دریاؤں، جھیلوں، ندی نالوں اور سرسبز و شاداب میدانوں کا خوبصورت ملک ہے۔ ڈھاکہ سے

سلہٹ جاتے ہوئے راستے میں دریائے میگنا، دریائے سورما اور دریائے سلہٹ سمیت کئی دریا اور بھیرب، آشوگنج اور گوالہ بازار جیسے کئی شہر اور قصبے آتے ہیں۔ جبکہ کشور گنج اور مولوی بازار جیسے شہر بھی اس سڑک سے زیادہ دور نہیں۔ سڑک کے دونوں طرف چاول اور سبزیوں کی فصلیں، ہرے بھرے اور گھنے درختوں میں گھری نظر آتی ہیں۔

تقریباً 5 گھنٹے کا یہ سفر ایک یادگار سفر تھا۔ راستے میں سڑک کے کنارے ایک ہوٹل میں چائے کے لیے رُکے تو اس وقت ایک بنگالی بزرگ اپنی اہلیہ کے ساتھ وہاں سے نکل رہے تھے۔ میں نے ان سے علیک سلیک کے بعد سلہٹ کے اہم اور قابل دید مقامات کے بارے میں دریافت کیا۔

جب میں نے بتایا کہ ہم پاکستان سے آئے ہیں تو وہ بزرگ میرا ہاتھ پکڑ کر چپ چاپ مجھے دیکھتے رہے۔ پھر کچھ دیر کے بعد دُور کہیں افق کی طرف دیکھنے لگے۔ میں ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ان کی آنکھوں میں نمی صاف نظر آ رہی تھی۔ تعارف ہوا تو پتہ چلا کہ وہ بیرسٹر ہیں اور ان کا تعلق سلہٹ ہی سے ہے۔ اس وقت وہ ڈھاکہ جا رہے تھے۔

میں نے پوچھا کہ: کیا آپ کبھی پاکستان گئے ہیں۔

انھوں نے کہا: ''ہاں، ایک دفعہ مغربی پاکستان گیا تھا۔ جب مُلک ٹوٹ رہا تھا۔ یہ پاکستان کے دو ٹکڑے ہونے سے ڈیڑھ دو ماہ پہلے کی بات ہے۔ میں کہیں جاتے ہوئے چند گھنٹوں کے لیے کراچی رُکا تاکہ قائد اعظم کے مزار پر فاتحہ پڑھ سکوں۔ میں نے ایئرپورٹ سے نکل کر ٹیکسی ڈرائیور سے کہا کہ وقت بہت کم ہے۔ مگر میں قائداعظم کے مزار پر ضرور جانا چاہتا ہوں، ڈرائیور کو میں نے اپنی اگلی فلائیٹ کا ٹائم بتایا تو اس نے گھڑی دیکھ کر کہا کہ وقت تو واقعی بہت کم ہے، آپ قائداعظم کے مزار پر اگلی دفعہ چلے جایئے۔ میں نے اسے کہا کہ نہیں، ابھی چلو، اگلی دفعہ اب کبھی نہیں آئے گی۔''

یہ کہتے ہوئے ان کے آنسو چھلک پڑے اور میں بھی بے اختیار رو پڑا۔ وہ بڑی دیر تک، بڑی محبت سے باتیں کرتے رہے۔ سلہٹ کے بارے میں بھی انھوں نے بڑی مفید معلومات دیں۔

ہم ایک بجے کے قریب سلہٹ پہنچے۔ چند بنگالی دوستوں نے وہاں اپنے کچھ ساتھیوں کو اطلاع کی ہوئی تھی۔ انھوں نے راستے میں بھی مسلسل ہم سے رابطہ رکھا۔ سلہٹ پہنچنے پر وہ ہمیں اپنے گیسٹ ہاؤس لے گئے، جہاں انھوں نے کھانے کا انتظام کر رکھا تھا۔ کھانے اور نماز سے فارغ ہو کر ہم اپنے ایک میزبان کی رہنمائی میں بنگلہ دیش کی عظیم ترین دینی و روحانی شخصیت حضرت شاہ جلالؒ کے مزار پر فاتحہ کے لیے حاضر ہوئے۔ ڈھاکہ

ایئر پورٹ کا نام اب انھی سے موسوم کر دیا گیا ہے، اور اب یہ حضرت شاہ جلالؒ انٹرنیشنل ایئر پورٹ کہلاتا ہے۔

بنگلہ دیش میں دیگر مقامات کی طرح حضرت شاہ جلالؒ کے مزار پر بھی اپنائیت کے کئی مظاہرے دیکھے۔ جب ایک بزرگ کو پتہ چلا کہ ہم پاکستانی ہیں، تو انھوں نے بڑی محبت سے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھ لیا۔ وہ بنگالی بزرگ اردو، یا انگریزی نہیں جانتے تھے۔ ان کی زبان سے دو دفعہ صرف پاکستان، پاکستان، کے الفاظ نکلے۔ مگر پھر خاموشی کی زبان میں نہ جانے پاکستان اور بنگلہ دیش کے مسلمانوں کے درمیاں محبت اور کبھی نہ ختم ہونے والے انوکھے رشتوں کے بارے میں کیا کچھ کہتے رہے۔

سلہٹ سے تقریباً 60 کلومیٹر آگے ہم بنگلہ دیش اور بھارت کی سرحد پر واقع تامابل کے مقام پر بھی گئے، جہاں بنگلہ دیش کے فوجیوں نے یہ پتہ چلنے پر کہ ہم پاکستانی ہیں، بڑی گرم جوشی کا مظاہرہ کیا اور ہمارے ساتھ تصویریں کھنچوائیں۔ وہاں سے قریب ہی بولا گھاٹ اور جیفلا نگ بھی گئے اور پھر واپسی پر تقریباً ساڑھے چھ بجے ہم سلہٹ پہنچے۔ وہاں سے شام سات بجے روانہ ہوکر رات ایک بجے ڈھاکہ پہنچے۔

سلہٹ سے ڈھاکہ واپسی کا یہ سفر بھی بڑا دل فریب تھا۔ رات تھی، چاند کی چاندنی تھی۔ چاند ہمارے اوپر بائیں طرف ساتھ ساتھ سفر کر رہا تھا۔ بنگلہ دیش کی اس چاندنی رات میں ایک عجیب طلسماتی حسن تھا، کشش تھی، جاذبیت تھی، اپنائیت تھی، ہجر و وصال کے ایسے احساسات تھے، جو پاکستان سے آنے والا کوئی مسافر ہی وہاں محسوس کر سکتا تھا۔

بنگلہ دیش میں پاکستان کے ہائی کمشنر جناب افراسیاب بڑے فرض شناس اور نیک نام افسر ہیں۔ ان کی بڑی تعریف سُن رکھی تھی۔ اس لیے ان سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا، مگر کانفرنس کی مصروفیت اور سلہٹ کے سفر کی وجہ سے ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ پی آئی اے کی واپسی کی پرواز ڈھاکہ کے حضرت شاہ جلالؒ انٹرنیشنل ایئر پورٹ سے جس وقت روانہ ہوئی، اس وقت بنگلہ دیش (سابقہ پور بو پاکستان) میں سہ پہر تین بجے اور پاکستان (سابقہ مچھمی پاکستان) میں دو بجے تھے۔

اس طرح وہ یادگار سفر اختتام پذیر ہوا، جس میں ملنا بھی تھا اور بچھڑنا بھی۔ جس میں 1906ء 1940ء اور 1947ء کے ایمان افروز تصوراتی لمحات بھی تھے اور 1971ء کے دُکھ بھرے واقعات بھی۔ جس میں محبت بھی تھی اور ندامت بھی۔ جس میں حسرتیں بھی تھی اور آنسو بھی۔ جس میں ایک گھر، ایک جسم اور ایک دل کے دو ٹکڑے ہونے کے دل گداز مرحلے بھی تھے، اور ٹوٹے ہوئے دلوں کے کبھی نہ ٹوٹ سکنے والے رشتوں کی مہک بھی۔

☆☆☆

غزل

جسم مجھ کو دیا ہے مٹی کا
کیا بھروسہ ، بھلا ، ہے مٹی کا

ہم یہاں بیٹھے ہیں فلک اوڑھے
جگ میں میلا لگا ہے مٹی کا

کس قدر بوجھ اٹھائے رکھا ہے
یہ تو بس حوصلہ ہے مٹی کا

یوں نہیں کہ امان کوئی نہیں
کچھ نہ کچھ آسرا ہے مٹی کا

خوب سامانِ شب میسر ہے
خواب، دل اور دیا ہے مٹی کا

کام سارا سمیٹیے صاحب!
اب یہی مشورہ ہے مٹی کا

شورِ ہستی میں چھیڑتے ہیں صہیبؔ
تذکرہ گاہے گاہے مٹی کا

(صہیب اکرام)

حمدِ باری تعالیٰ

یہ جو آسمان وزمین کو تُو نے چھ دنوں میں بنا دیا
سرِ کائنات میرے خدا! تُو نے اپنا سکہ جما دیا

دیئے گر زمین کی گود میں یہ پہاڑ و دریا و دشت و بن
تو فلک پہ ماہ و نجوم کا تو نے کاروبار چلا دیا

تو نے بارشوں کے نزول سے نئی زندگی دی زمین کو
وہ جو مردہ ہونے کو تھی اسے تو نے قابلِ کاشت بنا دیا

کہیں صبح بھیج کے روشنی درِ شب سے کھینچ لی تیرگی
کہیں دن کے دوش پہ رات کو یہ دوشالہ تو نے اوڑھا دیا

تیرے حکم پہ ہی سحابوں نے بھریں اپنی اپنی یہ گھاگھریں
تو ہوا کے دوش پہ لاد کے جہاں چاہا تو نے چلا دیا

سرِ طاق جاں جو چراغ تھا اسے پھر سے جلنے کی تاب دے
کہ ہوائے خواہشِ نفس نے اسے دھیرے دھیرے بجھا دیا

(شمیم فاطمہ)

دسمبر

دسمبر

یاد سے لبریز پیالی ہے

کہ جس سے بھاپ اٹھتی ہے تو.....

دل میں اک نمی اتری ہوئی محسوس ہوتی ہے

ذرا سا گھونٹ بھرتے ہی

دریچے کھلنے لگتے ہیں

کوئی بچھڑا ہوا اپنا

کوئی بھولا ہوا چہرہ

کوئی ٹوٹی ہوئی بربط

ندی، جھرنے، ہوائیں

بادبانی کشتیاں

سنہرے کھیت پٹ سن کے

گھنے جنگل، یہ نیلا آسماں

جھلمل ستارے

یہاں کا مینہ برساتا ہوا بادل

اب ان سے جو تعلق تھا، معطل ہو چکا ہے

جو تھی وابستگی منسوخ کر ڈالی گئی ہے

انہیں اپنا سمجھنا، اپنا کہنا،

جرم ٹھہرا ہے

ہمیں جغرافیائی طور پر تقسیم کر ڈالا گیا ہے

خود اپنی سرزمین، اپنی ہی سرحد پر

نئی پرچم کشائی ہو رہی ہے

ابھی جو درد کی اک لہر اٹھی ہے

وہ میرے اک مکمل جسم سے

بازو کے کٹنے کی اذیت ہے

ادھورا جسم! آدھی سرزمین

بچھڑنے، ٹوٹنے، کھونے کا منظر

دسمبر

وقت کی آنکھوں میں

اک ٹھہرا ہوا آنسو!!

یہ دیوانے

اخوان المسلمون کی سرفروشی سے متاثر ہو کر لکھی گئی جن کے لئے میدان رابعہ کو مقتل بنا دیا گیا

یہ شمع حق کے پروانے — یہ دیوانے یہ فرزانے
کس شان سے نکلے اہل وفا — سر میں کٹوانے
سر لئے ہتھیلی پر اپنا — آئے سر مقتل دیوانے
کس ڈھنگ سے وہ مقتل میں گئے — ایمان کی قوت دکھلانے
جو عشق کی بازی جیت گیا — وہ سودوزیاں کو کیا مانے
یہ بازی عشق کی بازی ہے — وہ دشمنِ ایماں کیا جانے
ہرگز نہ بدل سکتا کوئی — یہ عہدِ وفا کے پیمانے
ایمان سے جو محروم رہا — وہ اس کی لذت کیا جانے
وہ مصری ہوں یا اخوانی — سب راہ حق کے دیوانے
ہوں ایرانی یا افغانی — سب ہی ہیں جانے پہچانے

سب ایک ہی راہ کے راہی ہیں
سب ایک ہی رب کے دیوانے

(ذکیہ فرحت)

زحمت سے رحمت

سارا دن تھکی تھکی اور نڈھال رہنے والی حمنہ کو پتہ ہی نہ چلا کہ یہ تھکاوٹ موسم بدلنے کی وجہ سے نہیں ٹائیفائیڈ کی وجہ سے ہے۔ تھرما میٹر لگا کر دیکھتی تو ننانوے پر پارہ رک جاتا۔ اب ننانوے کا ہندسہ تھرما میٹر کی زندگی میں تو کوئی معتبر نہیں سمجھا جاتا ہاں سو بخار بھی ہوتا تو وہ دھڑلے سے کہہ سکتی تھی کہ ''امی مجھے سو بخار ہے۔''

ایک سو ڈگری بخار..... بہر حال بیماری کی دنیا میں کچھ نہ کچھ اہمیت رکھتا ہے.....!! پر کیا کریں کہ ننانوے ڈگری کو وہ ایک سو ننانوے کیسے کر دکھاتی۔ پورا ایک مہینہ انہی تھکاوٹوں میں گزرا ایک دن خوب درد ہوا۔ بھوک ختم، چلتے چلتے نڈھال ہو کر گر پڑی.....!!!

اس کے گرنے سے سبھی کے کان کھڑے ہو گئے، بھانت بھانت کی بولیاں بولی جانے لگیں۔

''ارے حمنہ کا رنگ تو دیکھو کتنا پیلا ہو رہا ہے۔'' دادی نے کہا۔

''اور حالت دیکھو جیسے سوکھا تنکا، ہڈیاں ہی ہڈیاں۔'' ابو بولے فوراً ہسپتال لے جایا گیا۔ ڈاکٹر نے ماتھے پر ہاتھ رکھا، زبان نکالنے کو کہا۔

''ٹائیفائیڈ.....'' سر اٹھائے بغیر ڈاکٹر نے کہا۔

''ک..... کیا.....؟؟'' امی نے چیخنے کے سے انداز میں کہا۔ ''ٹا.....ئی.....فائڈ.....'' ان کا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے تھا۔

''جی اور کافی پرانا لگتا ہے۔'' اب کہ ڈاکٹر ان سے مخاطب تھا۔ پھر اس نے حمنہ سے سوال کیا۔

''بیٹے! پیٹ میں درد تو نہیں ہوتا۔''

''جی اکثر ہوتا ہے۔'' حمنہ نے نقاہت سے کہا۔

''کب سے؟''

''تقریباً تین چار ہفتوں سے۔'' حمنہ نے کہا۔

ڈاکٹر نے چٹ پکڑائی ''یہ ٹیسٹ کروائیں پھر میڈیسن لکھوں گا۔ ہاں کچھ احتیاطی تدابیر ضرور کریں جب بھی گرمی محسوس ہونے لگے تو پانچ سات منٹ ضرور نہائیں۔ خواہ دن میں دس دفعہ نہانا پڑے۔ فی الحال لیکوئڈ زیادہ دیں، دودھ سیون اپ، سکنجبین، دلیہ وغیرہ پھر جو دل چاہے کھائے۔''

ابو نے چٹ پکڑی حمنہ کو ساتھ لیا اور لیب چلے گئے۔ امی ویٹنگ روم میں چلی گئیں۔ لیب میں زیادہ رش نہیں تھا۔ چالیس بیالیس منٹ میں ہی رپورٹ بھی مل گئی جو ڈاکٹر صاحب کے سامنے پیش کر دی گئی۔ رپورٹ دیکھ کر وہ چونکے۔ امی کی تو جان مٹھی میں

اور کلیجہ حلق میں آ گیا۔''اللہ خیر۔''ان کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔میرا اندیشہ درست ہے بچی کا ٹائیفائڈ ہی نہیں بگڑا بلکہ کِڈنی کا پرو بلم بھی ہے کم از کم تین چار دن ہاسپٹل میں رہنا پڑے گا۔اور فی الحال اسے آئی سی یو میں بھیج رہے ہیں۔انہوں نے حمنہ سے پھر سوال کیا۔

''بیٹے موشن تو نہیں ہیں؟''

''جی،ڈاکٹر صاحب.....بہت دنوں سے ہیں۔''

''اوہ مائی گاڈ۔''نرس اور وارڈ بوئے پاس ہی تھے۔

''اسے فوراً آئی سی یو میں لے جائیں۔سٹریچر پر۔''امی تو یہ سن کر ہی نیم جان ہو گئیں۔

ڈاکٹر کے تین چار دن ایک ہفتے میں بدل گئے۔صبح شام ڈرپس کا سلسلہ رہتا۔اینٹی بایوٹک انجکشن لگتے۔بار بار ٹمپریچر لیا جاتا۔

امی نے صدقہ خیرات کیا۔ہر نماز کے بعد لمبی سی دعا مانگتیں حمنہ کو تسلی دیتیں''بیٹے! بیماری اللہ کی رحمت ہوتی ہے۔اللہ گناہ معاف کرتا ہے اور درجات بلند کرتا ہے۔''تیمارداری کرنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ابو اور امی دونوں کا سوشل سیٹ اپ اتنا وسیع تھا کہ دو تیمار دار بیٹھے ہوتے دو اور آ جاتے۔ہسپتال میں خوب رونق رہتی۔جو بھی آ رہا ہے ساتھ میں پھل، جوسسز اور کوئی تو دلیہ،کھچڑی،سوپ،یخنی بھی بنا کر لاتے۔

امی نے تیمارداری کے آداب کمرے کی دیوار پر لٹکا دیئے۔آنے والے پہلے حمنہ سے حال چال پوچھتے۔ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دعا دیتے پھر''بیماری تو اللہ کی رحمت ہوتی ہے''کا مخصوص فقرہ۔دو چار منٹ بیٹھ کر رخصت ہو جاتے۔

حمنہ کی کولیگز بھی آتی تھیں۔ہنسی مذاق میں ماحول کو''صحت مند''رکھنے کی بھرپور کوشش ہوتی۔

''ارے گناہ بہت زیادہ ہو گئے تھے جو بخشوانے کے لئے بیماری کو بلا لیا۔''حمنہ کی کلاس فیلو نے شرارت سے کہا۔

''نہیں بھئی!اس کی بیماری تو ہم پر احسان ہے ستر ہزار فرشتوں کو ہمارے ساتھ یہاں آنا پڑا۔''دوسری چہکی۔

''ستر ہزار فرشتے؟''مہک نے حیرانی سے پوچھا۔اس کے علم میں شاید یہ حدیث نہیں تھی۔

''تو اور کیا۔بیمار کی تیمارداری کے لئے جانے والے کے ساتھ ستر ہزار فرشتے ہوتے ہیں جو اس کے لئے دعا گو رہتے ہیں اور جتنی دیر وہ مریض کی تیمارداری کرتے ہیں اتنی دیر تیماردار جنت کے میوے چنتے رہتے ہیں۔''حفصہ نے حدیث سیاق وسباق کے ساتھ سنائی۔

''یہ تو بہت بڑی بات ہے،مہک سناٹے میں تھی، اس کا مطلب ہے بیمار پہ اللہ کا خاص کرم اور رحمت ہوتی

ہے۔''اس نے کہا۔

''جی، بالکل ، بالکل۔ ایک ہفتے سے رحمتیں سمیٹ رہی ہو بہت سمیٹ لیں اب بس کرو۔'' سب کورس میں بولیں۔

حمنہ مسکرائی۔ اب اس کے چہرے پر قدرے تازگی تھی۔ وہ ان کو رخصت کرنے اپنے کمرے کے دروازے تک بھی آئی، سب کے نہ نہ کرتے بھی۔

''آج شام کو آپ کو ڈسچارج کر دیا جائے گا۔'' نرس نے خوشخبری سنائی۔ حمنہ کی کلاس فیلوز اور کولیگز چھوٹے چھوٹے گفٹ دے گئی تھیں، ایک خوب صورت سا پاؤچ ،ایک کلپ، ایک شاعری کا مجموعہ، ایک ننھی منی سی کرسٹل کی چین۔

امی سب چیزوں کو سمیٹا سمیٹی میں مصروف ہوگئیں۔اُف پندرہ کلو کے قریب تو سیب ہی تھے، کیلے ،انگور،انار اور جوس الگ سے.....کافی زیادہ سامان ہوگیا تھا۔ اردگرد کے کمروں میں امی نے کچھ پھل اور جوس بھجوائے۔ ساگودانہ اور کھچڑی برتنوں میں کافی پڑی تھی وہ بھی جنرل وارڈ کے مریضوں کو بھجوائی۔ تیمار داری کے آداب والا چارٹ ہاسپٹل کے مین گیٹ پر لٹکا دیا۔مریض کے لئے کچھ دعاؤں کے سٹیکرز تھے وہ بھی ہر وارڈ میں لگوائے اب بس ڈاکٹر کا انتظار تھا وہ آئے اور کب کہے کہ بچی اب بالکل تن درست ہے آپ آج ہی جا سکتے ہیں۔ ہاں حمنہ کچھ گومگو میں تھی۔ ہر آنے والے کی زبان سے ''گھبرانا نہیں بیماری تو اللہ کی رحمت ہوتی ہے۔'' سن سن کر یہ تو سمجھ میں آ گیا تھا کچھ کمیاں کوتاہیاں معاف ہوگئیں کیا گناہوں کا بخشے جانا ہی بیماری کو رحمت بناتا ہے؟

بیمار کا دل تو ویسے ہی بڑا رقیق ہوتا ہے گناہ کا ہولناک لفظ سن کر آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اسے روتا دیکھ کر امی بھی رونے لگیں۔

''بہت صبر سے بیماری کو برداشت کیا میری بچی نے، اللہ نے بڑی رحمت کی۔تمہیں پتہ ہے ناں جب تک بندہ مرض کی حالت میں ہوتا ہے اللہ کی توجہ اور التفات میں رہتا ہے۔''

حمنہ کو جھرجھری سی آئی۔ اس کا مطلب ہے تب سے اللہ میری طرف ملتفت تھا!

''بی بی جی ڈاکٹر صاحب ایمرجنسی میں ہیں یہ سائن کر دیں ڈسچارج سرٹیفکیٹ ہے۔'' وارڈ بوائے نے کاغذ آگے کیا۔

آدھے گھنٹے میں حمنہ، امی ،ابو اور بھیا کا قافلہ ہسپتال سے روانہ ہوا۔امی نے جمعدارنیوں کو چپکے سے پیسے پکڑا دیئے۔ سب رخصت کرنے وارڈ کے مین گیٹ تک آئے۔اللہ پاک ہماری بی بی کو ہمیشہ صحت مند رکھیں، سب سے بزرگ خاکروب نے دعا دی۔گھر پہنچ کر حمنہ حیران رہ گئی۔اس کے قدم ساکت ہوگئے۔ اس کی نظروں میں بے یقینی ہی بے

یقینی تھی، اس کی آنکھوں کے کٹورے برسنے کو بے تاب تھے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رو پڑی۔ گھر کے دروازے سے اندر تک استقبالیہ کلمات اہلاً وسہلاً مرحبا۔

اللہ حمنہ آپی کو ہمیشہ ہنستا مسکراتا رکھے۔ خوشامدید جیسے فقرے۔ غبارے، جھنڈیاں، Get Well Soon کے بے تحاشا کارڈز۔ اور اس سے بھی ہٹ کر طرح طرح کے تحائف محبتیں، دعائیں، خلوص، چاہت، حمنہ کا منا سا دل اتنی چاہت کے اظہار کو سنبھال نہ سکا۔ سارے عزیز رشتے دار اس کی خبر گیری کرنے کو اس سے پہلے موجود تھے۔ جو ہسپتال نہیں جا سکے وہ بھی، اور جو گئے تھے وہ بھی۔

رات کو سونے سے پہلے جب وہ اللہ کی رحمتوں کا حساب کتاب کر رہی تھی، شکر گزار ہو رہی تھی تو امی نے چپکے سے اس کے ہاتھ میں بند لفافہ پکڑا دیا۔

تمہارے علاج کے لئے تمہارے دادا ابو اور نانی اماں نے بھجوائے ہیں۔ حمنہ نے لفافہ کھولا۔ خاصی بڑی رقم تھی اس نے ایک لمحے کے لئے سوچا اور لفافہ امی کو پکڑا دیا۔

''امی یہ آپ لوگ رکھ لیں میرے لئے اللہ کی رحمت اور اللہ کے بندوں کی محبتوں کا اظہار ہی بہت ہے، سب مجھ سے کتنا پیار کرتے ہیں یہ کتنی بڑی بات ہے۔''

امی نے جھک کر اس کے ماتھے پر پیار کیا اور کہا ''ہاں بیٹے! ان سب محبتوں کا عملی ثبوت وہ دعائیں ہیں جو ہر ایک نے وافر مقدار میں تمہیں دے کر ثابت کر دیا کہ اللہ نے زحمت میں رحمت رکھ دی ہے۔''

☆☆☆

جویریہ سعید۔البرٹا

میری ذات کا جونشاں ملے

وہ جو جنگل کے راستے پر پھول جمع کیا کرتی تھی۔ بولتی سوچتی آنکھوں والی ایلس۔ پھول چننا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا، خاص طور پر ایسی جھاڑیوں میں ننھے پھول ڈھونڈھنا جن میں کانٹے بہت ہوتے ہیں۔مشغلے تو اس کے اور بھی بہت سے تھے، کتابیں پڑھنا، کہانیاں لکھنا اور خواب بننا، اس کا خواب تھا کہ وہ کہکشاں کے تاروں کی دودھیارا ہگزر پر قدم قدم چلتی چاند دیس پہنچ جائے اور وہاں سے دنیا کے باسیوں پر پھول نچھاور کرے، سفید بادلوں پر چھلانگیں لگاتی پھرے اور جہاں جہاں خشک سالی ہو، وہاں ان بادلوں کو گدگدا کر بارش برسا دے اور خود دھنک پر پھیلتی برف پوش پہاڑوں پر پہنچ جائے۔

اس کا یہی خیال تھا کہ چاند پر خوشیاں چھپی ہیں، جبھی تو سب خواب دیکھنے والے چاند سے محبت کرتے ہیں، لوگ اسے احمق سمجھتے تھے، مگر اسے اس بات سے شدید چڑ تھی، وہ سوچا کرتی کہ کاش یہ احمق کہنے والے بھی چیزوں کو اس گہرائی سے دیکھا کرتے، جیسے میں دیکھا کرتی ہوں۔

اس کے اندر کے موسم بڑے شدید تھے جو اسے بے کل کیے رکھتے تھے۔ یہ بے کلی اس وقت اور زیادہ بڑھ جاتی جب ان موسموں کی شدت انسانوں کے ساتھ اس کے رابطوں اور تعلقات کو پریشان کرنے لگتی، ایسے میں وہ گھبرا گھبرا کر دوسروں کا اور زیادہ خیال رکھتی۔ ہر ایک سے پوچھتی پھرتی آپ خفا تو نہیں؟ آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ لائیے میں آپ کے لئے ان مرتبانوں میں سیب اور آلو بخاروں کے مربے بھر دوں اور آپ کی دالیں چن کر صاف کر دوں۔ دیکھیں میں نے مرغیوں کو دانہ بھی ڈال دیا ہے اور مچھلیوں کو کھانا بھی دے دیا ہے۔ جی ہاں، میں نے بالکل خیال رکھا ہے کہ زیادہ کھانا نہ دوں، ورنہ یہ بیمار پڑ جائیں گی۔ اسی طرح کی باتیں کرتے وہ کھلکھلا کر ہنستی جاتی اور لوگ کہتے، ایلس کتنی ہنس مکھ ہے اور کتنی مزیدار باتیں کرتی ہے۔

باتیں بنانا تو اس کو خوب آتا تھا۔ بسورتے چہروں پر مسکراہٹ بکھیر دینا، سنجیدہ اور بردبار لوگوں کو حیران کر دینا اور شرارتی لڑکیوں میں قہقہے لگانا تو اس کی خاص خوبیاں تھیں۔ تم جانو کہ وہ لڑکی جسے یقین تھا کہ جس جنگل کے راستے پر وہ پھول چنا کرتی ہے اس میں ہی کہیں پرستان کو جانے والا راستہ چھپا ہے، اس لڑکی کے دل میں محبت کا ایک جھرنا بہتا تھا۔ محبت جو اس دنیا

کو قائم رکھنے کے لئے اتنی ضروری ہے جتنا زندگی کے لئے ہوا، پانی اور حرارت۔ جلدی جلدی فضول باتیں کرنے والی وہ لڑکی بڑی فیاضی سے اب محبت تقسیم کیا کرتی تھی۔

پھر ایک روز یوں ہوا کہ اس کی دوست سنو وہایٹ نے اس کے گلابی پھولوں والے بستر پر چلغوزے کھاتے اس سے پوچھا کہ تمہاری ممی پوچھتی ہیں کہ ناصر احمد کے پروپوزل پر تم نے اتنا عجیب ری ایکٹ کیوں کیا؟ اچھا بھلا، پڑھا لکھا، قابل اور شریف نوجوان ہے۔ تمہاری تمام عجیب وغریب باتوں کے باوجود تمہیں اپنانا چاہتا ہے تو تمہیں کیا مسئلہ ہے؟

ایلس جو اس وقت ہونے والے سیمینار کے لئے ایک دھواں دھار تقریر لکھنے میں شدید مصروف تھی، سر اٹھا کر بس اتنا ہی بولی ''بھئی! یہ میری زندگی کی پلاننگ میں شامل نہیں ہے۔''

سنو وہایٹ نے چلغوزے ایک طرف رکھ کر پستوں کی پلیٹ سنبھالی اور بھنویں اچکا کر پوچھا ''کہیں کسی بدر بن مغیرہ کا انتظار تو نہیں؟ قسم سے ایلس مجھے خوب اندازہ ہے، تمہارا لیول اس سے کم کا ہو ہی نہیں سکتا، ایک انٹلیکچوئل شہسوار جو ذہین وفطین ہونے کے ساتھ ساتھ خوشبو، ستاروں اور روشنی جیسے الفاظ والے اشعار بھی پڑھتا ہو، پہاڑوں اور چشموں پر سے اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا آئے اور میدان جہاد میں شمشیر زنی کے کمالات دکھاتی آنسہ ایلس کو اٹھا کر لے جائے۔''

''استغفراللہ، یہ کس قسم کا غیر شرعی آئیڈیا ہے؟'' ایلس نے سارے صفحات کو دھیان سے فائل میں لگاتے تیوریاں چڑھا کر پوچھا۔

''فکر نہ کرو، غرناطہ کی پہاڑیوں کے پرے، شہر پناہ کے دروازے کے ساتھ وہ سرخ پتھروں والی مسجد بھی ہوگی جہاں سیاہ عمامہ باندھے ایک مرد درویش جناب کا نکاح مسنونہ اس مجاہد جری سے پڑھوا دیں گے۔''

ایلس کھلکھلا کر ہنس پڑی ''خیال بے ہودہ ضرور ہے لیکن دلچسپ ہے، زبردست سائکوانالیسس کیا ہے آپ نے میرا۔ مزہ آیا، مگر یقین جانو، یہ سب میری زندگی کی پلاننگ میں کہیں نہیں ہے۔''

سنو وہایٹ نے پستوں کی پلیٹ تپائی پر رکھ کر گلابی پھولوں والا تکیہ گود میں دبایا اور اپنی بڑی بڑی آنکھیں ایلس پر جما کر بولی ''دیکھو مائی ڈیر احمق دوست زندگی کو ہر پل خوابوں کی عینک سے نہ دیکھا کرو اور ویسے بھی ہر کہانی میں کسی نہ کسی موڑ پر ہر لڑکی کو کسی شہزادے، کسی لکڑہارے کے بیٹے یا کسی چرواہے کے ساتھ جانا ہی پڑتا ہے اور جو ایسا نہیں کرتیں ان کو عموماً ایسی چڑیلوں اور جادوگرنیوں کے کردار نبھانے پڑتے ہیں جو اوروں کی زندگیاں اجیرن کر دیتی ہیں۔''

ایلس نے بے حد اداس ہو کر کہا ''مگر میں ہیپی لی ایور آفٹر پر یقین رکھتی ہوں اسی لئے ڈرتی بھی ہوں۔''

سنو وہایٹ نے ایک دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ تکیہ سر کے نیچے دبایا اور آنکھیں موند کر بولی ''بس اسی ایک بات کو ہمیشہ یاد رکھنا۔''

اور ایک رات، بالکنی میں موتیا کی مہک کو سانسوں میں اتارتے، ایلس نے اداسی سے سوچا، ''کیا مجھے سنو وہایٹ کو بتا دینا چاہیے کہ میں نے کسی بدر بن مغیرہ نہیں، بلکہ اسی عام سی باتوں والے ناصر احمد کے بارے میں نہ چاہتے ہوئے بھی کتنی بار سوچا ہے، جب وہ عشق پیچاں اور بوگن ویلیا کی بیلوں کے نیچے، ابو کے ساتھ بیٹھا چائے پی رہا تھا، تو میرا جی چاہ رہا تھا کہ خواہ مخواہ وہاں جا کر ٹہلا جائے اور ان کی باتیں سنی جائیں۔ اپنے سارے خواب، آسمان کو چھو لینے والے ساری باتیں، سب جوشیلی تقریریں اور پرستان کی ساری کہانیاں ایک طرف رکھ کر، ہتھیلی پہ چہرہ ٹکائے اس بہت نارمل سی سوچ والے شخص کی عام سی باتیں دیر تک سنی جائیں اور وقت یہیں تھم جائے۔

اپنی ان معمولی سوچوں پر شدید دکھ محسوس کرتے اسے یقین ہونے لگا کہ ہماری زندگیوں کی ڈور ہمیں زندگی عطا کرنے والے کے ہاتھ میں ہی رہتی ہے۔ وہ ہمیں جہاں لے کر جانے والا ہوتا ہے، ہم دھیرے دھیرے خود کو اسی طرف موڑ کر اسی راستے پر رواں دواں ہونے لگتے ہیں تو پھر آنے والے موسموں کے لئے خود کو تیار کرنا ہی بہتر جب ان سے مفر ممکن نہیں۔

اور پھر ایک روز یہ ہوا کہ ایلس کے گھر والے اسے ایک کشتی میں بٹھا کر دور اس جزیرے پر اتار آئے جہاں ایک پہاڑی پر بنے محل پہ ناصر احمد کے نام کی تختی لگی تھی۔ ایلس ساحل پر بڑی دیر تک کھڑی اس کشتی کی طرف ہاتھ ہلاتی رہی جو اس کے پیاروں کو سمیٹے لمحہ بہ لمحہ دور ہوتی جا رہی تھی۔

تم جانو، اس جزیرے کی فضائیں بہت سرد تھیں، سبز درخت بہت کم تھے اور بس مختصر سے موسم گرما میں سبز رہتے، پھر منجمد کرتی سردیوں میں ٹنڈ منڈ شاخیں، چڑیلوں کی بھدی انگلیوں کی مانند معلوم ہونے لگتیں۔ وہاں تقریروں والے سیمینار نہیں ہوتے تھے اور شعر لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ کتابوں سے اس جزیرے کے لوگ بہت کم واقف تھے۔

اصل میں وہ سب بڑے پریکٹیکل قسم کے مصروف لوگ تھے، انہوں نے بڑی محنتوں سے اپنے لئے بڑے بڑے گھر بنائے تھے اور ہر وقت ان کے بارے میں بہت فکرمند بھی رہا کرتے تھے۔ ان کے لڑکے پڑھے لکھے تھے، اور جلد ہی اچھے عہدوں پر فائز ہو کر پریکٹیکل قسم کی کامیاب زندگی کا آغاز کر دیتے تھے۔ ان کی لڑکیاں اپنے لیے قیمتی جہیز تیار کیا کرتیں اور اپنے شوہروں کے گھروں میں کامیاب زندگی گزارنے کے ممکنہ طریقوں پر ڈسکشن کیا کرتیں۔ ایلس کی باتوں کو سننے اور سمجھنے والا وہاں کوئی نہیں تھا۔ اور ان سب کے ساتھ

رہتے اس کو شک سا ہونے لگا کہ اس کی باتیں اور خواب واقعی احمقانہ تو نہ تھے؟ بھلا کوئی ستاروں پہ چل کر چاند دیس بھی جا سکتا ہے جب زمیں پر ہی کرنے کو اتنے کام ہوں۔ اندر کے موسم تند و تیز ہوتے جاتے اور وہ دوسروں کا اور زیادہ خیال رکھتی جاتی۔ فرش کو چمکا چمکا کر دھونا، برتنوں کو پالش کروا کر چمکانا، نت نئے کھانوں کی ترکیبیں صبح و شام نوٹ کر کے ہر روز ایک نیا ذائقہ دسترخوان پر متعارف کروانا، اور شام کو گھر کی باقی خواتین کے ساتھ بیٹھ کر بڑی اہم قسم کی ڈسکشن نہایت انہماک سے سننے کی کوشش کرنا، مثلاً اپنے بیش قیمت لباسوں میں، قرینے سے سیٹ بالوں کو جھٹکتے شکوے کیا کرتیں کہ انہیں خود پر توجہ دینے کا ٹائم تو مل ہی نہیں پاتا، کیونکہ سارا دن وہ اپنے خوبصورت گھروں کی سجاوٹ اور نت نئی بیکنگ اور اچار اور مربوں کی تیاری میں اس قدر مصروف رہتی ہیں۔ پھر گفتگو کا رخ لپ سٹک اور آئی شیڈز کے نئے برانڈز سے ہوتا اس قسم کی ماہرانہ پیش گوئیوں کی طرف مڑ جاتا کہ آنے والے دنوں میں شلواروں کے پائنچے کھلے فلیپر سٹائل کے ہو جائیں گے یا چوڑی دار پاجاموں کا ہی فیشن ان رہے گا۔ ان سب کاموں کے بیچ اگر کبھی تنہائی میسر آتی تو اندر سے اٹھتی دبی دبی آوازیں پوری شدت سے خفگی کا اظہار کرنے لگتیں اور وہ روہانسی ہو کر سوچے جاتی کہ زندگی کے کس سٹیج پر کیا غلط کیا تھا جس کی بنا پر اگلے مناظر میں سب گڑبڑ ہو گیا۔

ناصر احمد بے چارے بھی پریشان سے ہی تھے، وہ ان کا خیال بھی رکھتی، گھر کو بھی سنبھالتی مگر پھر بھی وہ انہیں ایک ایسے قیمتی اور شاندار کوٹ کی مانند لگتی جو ان کو فٹ نہیں تھا اور اس کو پہن کر وہ بے آرامی محسوس کرتے ہوں۔ کبھی اسے پرشوق نگاہوں اور مسکراتے لبوں کے ساتھ کسی کتاب یا کسی مووی میں گم دیکھ کر پوچھا کرتے کہ ڈیر! کیا دیکھا جا رہا ہے؟ تب بہت پرشوق انداز میں کچھ اس قسم کا جواب ملتا ''بہت دلچسپ کہانی ہے، آیئے، آپ بھی دیکھئے، وینڈی نے پیٹر پین کے سائے کو اس کے پیروں سے سی دیا ہے، اب وہ اس سے الگ ہو کر نہیں بھاگ سکے گا۔ اب وہ اپنے بھائیوں کو لے کر، پیٹر پین کے ساتھ نیور لینڈ چلی جائے گی جہاں بچے کبھی بڑے نہیں ہوتے، پریاں حسد کے عرق سے مر جاتی ہیں اور یقین کے بولوں سے جی اٹھتی ہیں۔ قزاقوں کا سردار محبتوں سے محروم اپنی بدصورت سوچوں کے ساتھ سمندری عفریت کا نوالہ بن جاتا ہے۔''

ناصر احمد نے اکتا کر کہا ''یہ آپ بچوں والی احمقانہ حرکتیں چھوڑ کیوں نہیں دیتیں؟'' ایلس نے چونک کر انہیں دیکھا اور پھر یکا یک کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''ارے میں تو مذاق کر رہی تھی، میں بھلا یہ سب کہاں دیکھتی ہوں؟ آیئے یہ بل فائٹنگ دیکھتے ہیں۔ کتنا زبردست بیل ہے اور اس نوجوان کی پھرتی تو دیکھئے کیسے اسی بیل کو چکمہ دے جاتا ہے؟'' اس پل

ناصر احمد کو اس گھنگریالے بالوں والی لڑکی پر بہت ترس آیا جو کبھی بے تحاشہ باتیں کرتی اور کبھی بالکل خاموش ہو جاتی، اس لمحے جب کھلکھلاتے ہوئے اس کی آنکھ سے اک شفاف موتی پھسل گیا تھا اسی لمحے انہوں نے فیصلہ کیا کہ اسے یوں نہیں ٹوکیں گے، کاش ان کے بس میں ہوتا اور وہ اسے وہ سب دے پاتے جو اسے چاہیے تھا لیکن اسے کیا چاہیے تھا، یہ ان کی سمجھ میں کبھی نہیں آیا۔

زندگی کے اس اداس اور سرد کمرے میں بیٹھ کر اون کے ان گولوں کو سلجھانے کی کوشش کرتے کرتے جو آپس میں بری طرح الجھ گئے تھے، اس کے ساتھ تین گھنگھریالے بالوں والی خرگوشنیوں اور ایک بولتی سوچتی آنکھوں والے ننھے خرگوش کا اضافہ بھی ہو گیا تھا زندگی کی تھکن کتنی بڑھ گئی تھی۔

اپنی خرگوشنیوں کے گھنگھریالے بالوں کی پونی ٹیلز بناتے وہ انہیں سمجھایا کرتی کہ ان کی گلابی، کاسنی اور بنفشی فراکوں کی فرل بالکل خراب نہیں ہونی چاہیے۔ انہیں یہ خوب اچھی طرح سیکھ لینا چاہیے کہ کس موقع پر کون سا لباس اور کس لباس کے ساتھ کون سے پھول مناسب لگیں گے۔ انہیں اچھی لڑکیوں کی طرح سنبھل سنبھل کر تکلف سے بولنے اور انداز سے چلنے کی کوشش کرنی چاہیے کیونکہ شہزادے سے شادی کرنے کے لئے سنڈریلا کو بھی بہترین گلابی فراک، ہمرنگ زیورات اور نہایت قیمتی بلوریں جوتوں کی ضرورت پڑتی ہے اور شاندار گھوڑوں والی قیمتی بگھی تو کس قدر ضروری ہے۔ یہ سب کہتے اس کے اندر کوئی تڑپتا، فریاد کرتا رہتا، مگر وہ سختی سے ان آوازوں کو دبائے انہیں یہ سب سکھائے جاتی اور ننھی خرگوشنیاں ماں کی آنکھوں میں چمکتے پانی کو حیرت سے دیکھا کرتیں۔

مگر ہماری زندگی کی باگیں ہمیں زندگی عطا کرنے والے کے ہاتھ میں ہی رہتی ہیں لہٰذا اس کے باوجود بھی لالہ رخ، جہاں آرا اور ماہ رخ کو کتابوں سے دلچسپی تھی اور شاہ زیب تصویریں بنایا کرتا تھا وہ ساحل پر مچھیروں کے بچوں کے ساتھ کھیلتے اور اپنے کپڑوں میں ساحل کی چمکیلی ریت بھر لاتے۔ ایلس ان باتوں سے سہم جایا کرتی تھی اور گھبرا گھبرا کر انہیں خوب ڈانٹتی۔

ایک تہوار کی شام جب سب آتش دان کے پاس بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے تو لالہ رخ نے سب کو اپنی نئی کہانی سنائی، ماہ رخ نے سیپیوں اور گھونگھوں کی بنی وہ اشیا دکھائیں جو انہوں نے مچھیروں کے بچوں کے ساتھ مل کر بنائی تھیں اور جہاں آرا کم گو شاہ زیب کی وہ تصویر لے کر آئی جس میں نوکیلی پھندنے والی ٹوپی پہنے ایک چھوٹا سا لڑکا آدھے چاند پر بیٹھا بانسری بجا رہا تھا۔

وسیع ڈرائنگ روم میں نرم گدیلوں میں دھنسے شاندار لوگ معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے

لگے۔ سنہرے رنگے بالوں والی بیگم فخرالنسا نے اپنی بہن کو ٹہوکا دیا اور اپنی روپہلی ساڑھی کے آنچل میں منہ چھپا کر ہنسنے لگیں۔ تو جناب وہی ہوا نا جس کا ڈر تھا۔ ایلس نے اپنے بچوں کو اپنی ہی طرح کا بگاڑا تھا۔ ویسی ہی حرکتیں، وہی شوق، یہ کوئی سوسائٹی میں اٹھنے بیٹھنے کے طریقے ہیں۔

مہ جبیں بھابھی چلغوزے چھیلتی بڑی بے نیازی بولیں ''اماں! شام کو گول گپوں کے پانی میں سونٹھ کی وہ خوشبو نہیں تھی جو ہونی چاہیے۔ آپ نے میری طرف بھی تو کھائے تھے نا خادم حسین کتنے زبردست بناتا ہے۔''

بڑی بیگم کی تیوریاں چڑھ گئیں ''ارے بھئی! ہم سے کچھ نہ کہو، کیا کیا برداشت کیے جاتے ہیں۔ پچھلی دعوت میں بھی جو کوفتے بنائے گئے تھے، ہمیں صاف محسوس ہو رہا تھا کہ کچھ چنے بھوننے کے دوران جلائے گئے ہیں اور ساتھ ہی پیس دیئے گئے ہیں۔ سب تعریفیں تو کر رہے تھے مگر سب اوپری تھا، جلن کا ذائقہ صاف زبان پر محسوس ہوتا رہا۔''

نورالنسا بیگم اپنے رنگے ہوئے ناخنوں کو بغور دیکھتے ہوئے بولیں ''سارا دھیان تو اس طرف ہوگا کہ جہاں آرا کی کہانی مکمل کروادی جائے، شاہ زیب کیلئے رنگ خریدنے کو ناصر بھائی سے کیسے خوشامد کی جائے اور لالہ رخ کے لئے کوئی نیا مضحکہ خیز اسکارف سی دیا جائے، تو ایسے میں گھرداری کے باقی سب کاموں میں کون دل لگائے؟''

فخرالنسا بیگم نخوت سے بولیں ''سکارف کی بھی خوب ہی رہی، پہلے خود ساری زندگی چادر لپیٹے پھرتی رہیں اور اب بیٹی کو تیار کیا جا رہا ہے، جسٹس صاحب کے گھر میں کتنی باتیں بنتی ہیں کہ ناصر احمد جیسے خوبرو اور قابل بھائی کے لئے ایسی دقیانوسی دلہن ڈھونڈی گئی۔''

بڑی بیگم کو ذرا کی ذرا غصہ آیا، ''ارے تو بتانا تھا نا، کہ ناک نقشہ تو ہم نے بھی دیکھا تھا، اچھا خاصا تھا، پڑھی لکھی بھی بہت ہیں۔''

فخرالنسا سر جھٹک کر بولیں ''میں کیوں وضاحتیں دیتی پھروں، جسٹس صاحب کو اپنی انسلٹ محسوس ہوتی ہے، ہر مرتبہ یہی کہتے ہیں کہ سچ بتایئے، آپ کی بھابھی صاحبہ اتنی ہی خوبصورت ہیں کہ ہم دیکھ لیں تو ان کو نظر لگ جائے گی یا کوئی داغ وغیرہ ہے جس کی وجہ سے چہرہ چھپائے پھرتی ہیں؟''

بڑی بیگم نے پان کی گلوریاں بناتے بناتے منہ بھی بنایا ''ارے ہم تو باز آئے جو کچھ اماں باوا کے یہاں سے سیکھ کر آئی ہیں اس کو ہم کہاں بدل سکتے ہیں؟''

جبیں بھابھی نے بڑے انداز میں نفیس جوڑے کو چھوا ''اور اب بیٹی کو بھی اسی راہ پر چلانے کا ارادہ ہے۔

رشتے کون دے گا ان لڑکیوں کو؟''

نورالنسا مسکرا کر بولیں ''ہوگا کوئی نہ کوئی ناصر بھائی کے جیسا ان کا ہی سٹیمنا ہے جو برداشت کے جاتے ہیں۔''

ناصر احمد نے ٹانگیں سیدھی کر کے صوفے کی پشت سے ٹیک لگالی اور پائپ سلگانے لگے۔ کانچ کے برتنوں کو بہت احتیاط سے خشک کر کے الماری میں لگاتے اس نے زہرخند مسکراہٹ کے ساتھ سوچا، ''یوں ہے تو یوں ہی سہی۔'' اور حلق میں بہت سا نمکین پانی بھرنے لگا۔

مگر درد کی جس پگڈنڈی پر وہ چل رہی تھی۔ اس پر سارے ہی مقام سنسان اور ویران تھے۔ جب اس کی اجلی رنگت کملانے لگی اور مخروطی انگلیوں پر لکیریں سے پڑنے لگیں تو ایک روز ناصر احمد اپسرا کو بیاہ لائے کانچ کی طرح نازک بدن اور راج ہنس کی طرح نازک مزاج اس نے پتھرائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ان کو دیکھا اور رات کے کھانے کے لئے تنجن تیار کرنے لگی۔

رات جب سب اپنے کیے اور کیے کے ممکنہ اثرات سے بے فکر میٹھی نیند سو رہے تھے وہ اپنا رنگ محل چھوڑ کر پہاڑی سے نیچے اتر آئی۔ سمندر کنارے اس بلند چٹان کی کگر پر بیٹھ کر اس نے وہ ڈھیروں آنسو بہا ڈالے جو اب تک سنبھال کر رکھے تھے۔

وقت بے وقت چلے آنے والے وہ آنسو جن کو آنکھوں میں روک کر رکھنا اس نے سیکھ لیا تھا۔ مگر ایک بار پھر اس سارے سیکھنے سکھانے کا کیا فائدہ ہوا؟

زندگی کی ڈور کبھی مرے ہاتھ میں رہی ہی نہیں کہ میں اس کا گلہ کرتی کہ کب کس لمحے، میں نے کیا غلط بویا کہ بعد میں سبزے کی جگہ یہ سارے نوکیلے کانٹے ہی میرا مقدر بنے ''اوڈ مین آوٹ'' کا کردار نبھانا میری ہی قسمت میں کیوں لکھا گیا؟ زندگی کی ڈوریں کس بری طرح الجھی ہیں کہ ان کو سلجھاتے سلجھاتے آنکھیں، گردن، انگلیاں سب ہی بری طرح تھک گئی ہیں۔ کیا سب کی طرح میں نے بھی اسی کارعبث میں اپنی زندگی بتانی تھی؟ تو یہ ہے اب تک گزاری زندگی کا حاصل۔

دھند لائی ہوئی آنکھوں سے اس نے سمندر میں جھانک کر دیکھا ہلکورے لیتے پانی میں چاند مسکرا رہا تھا۔ ''اوہ، میرا چاند دیس تو یہاں ہے سمندر کی گہرائی میں۔'' اس نے مسکرا کر سوچا۔ ''اور میں اس کو وہاں بستیوں میں تلاش کرتی ہوں۔'' اور پھر اس نے دیکھا کہ چاند نے اپنی بانہیں اس کے لئے پھیلا دیں اور چٹان کی کگر سے بپھرتے پانیوں تک ایک دودھیا رہگزر بن گئی اس نے اٹھ کر ہاتھ جھاڑے اور اپنے قدم اس طرف بڑھا دیئے۔

یک بارگی کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پیچھے کھینچ لیا۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا وہ ہوا میں معلق تھی، ٹھنڈی ہوا میں اس کا نقرئی لباس لہرا رہا تھا، اس کے چہرے پر

اپنا چہرہ جھکائے وہ سرگوشی کر رہی تھی ''جسے دریا کے بہاؤ کے مخالف سمت تیرنے کے لیے پیدا کیا جاتا ہے، اسے اس کی صلاحیت بھی دی جاتی ہے، حوصلہ کیوں ہارتی ہو؟ کیا کبھی تمہارے دل کے خالی ایوانوں میں کسی کی مہربان آواز نہیں گونجا کرتی جو تمہیں وہ سب کچھ دیے جاتا ہے جو اس نے اوروں کو نہیں دیا۔ بے آب و گیاہ صحرا میں حاجرہ کے سوا کون تھا جسے تنہا مقدس شہر بسانے کو چھوڑا گیا؟ ساری دنیا سے بلند کر کے مقدس مریم کا مرتبہ دیے جانے کو اور کس کو آزمایا گیا؟ یاد رکھنا، جس زمیں میں درد پلتا ہے وہ بہت زرخیز ہوتی ہے۔''

ایلس روہانسی ہو کر بولی ''مگر دریا کی تند و تیز لہروں سے میں کب تک تنہا لڑوں؟ میرے بازو شل ہوئے جاتے ہیں۔'' اس پر وہ مسکرا دی اور اس کے ساتھ سارا ماحول جگمگانے لگا، تنہا؟ تمہیں یاد ہے؟ آج اپنی پریشانی میں تم نے جہاں آرا کی ایک چوٹی بالکل ٹیڑھی گوندھی تھی، مگر اس نے کوئی شکایت نہیں کی، لالہ رخ کتنے شوق سے تم سے سکارف پہنا کرتی ہے اور ماہ رخ؟ اس کے آنسو کیسے کانچ کے سے معلوم ہوتے ہیں۔ خدا کرے اسے کوئی ایسا ملے جو اسکے آنسوؤں کو چھو کر موتی بنا دے۔''

ایلس ایک جھٹکے سے کھڑی ہوگئی اور کپڑے جھاڑ کر جلدی سے بولی ''ارے، تمہیں کیا خبر، مجھے پرسوں آنے والے جہاز رانوں کے میلے کے لئے شاہ زیب کو بہت سے کپ کیک اور نمکین سموسے بنا کر دینے ہیں تا کہ وہ اس روز انہیں وہاں گھومتے مچھیروں کے بچوں میں تقسیم کر سکے۔ رنگین جھنڈیاں اور پھول تو وہ سب خود مل کر تیار کر لیں گے۔'' اتنا کہہ کر وہ افراتفری میں وہاں سے بھاگ گئی۔

اگلے روز سہہ پہر کے وقت جب سب خواتین لان میں بیٹھی چائے پی رہی تھیں اور آنے والی تقریب کے لئے غرارے سلوانے کی پلاننگ کر رہی تھیں وہ خاموشی سے ان کے پاس سے گزر کر باہر نکل گئی اس کی باسکٹ میں سیب اور سڑابری کے بہت سے ٹارٹس تھے اور چاروں خرگوش پیچھے پھدکتے چلے آ رہے تھے۔

جھرنے کے پاس اس نے انہیں اس ڈریگن سیلر کی کہانی سنائی، جو کتنی مشکلیں عبور کر کے جب ڈریگن پر قابو پا لیتا ہے، تو اسکو قتل کرنے کے بجائے اس کا دوست بن جاتا ہے۔ بھورے بالوں والا ننھا چرواہا اور پانی بھر کے گھروں کو جاتی خادمین کی لڑکیاں بھی اس کے پاس بیٹھ کر کہانی سننے لگیں۔ پھر سب نے ٹارٹس کھائے اور گھر کو لوٹ گئے مگر گھر کو لوٹنے سے پہلے اس نے اپنی تازہ لکھی کہانی شیشے کی بوتل میں بند کر کے سمندر کے حوالے کر دی۔

☆☆☆

شاہدہ ناز قاضی

نایاب

پانچویں منزل سے نیچے کا نظارہ بہت دلکش تھا۔ سامنے بڑی سی شیشے کی کھڑکی تھی۔ نیچے دور تک سڑکوں کا جال بچھا تھا۔ جو سامنے تک چلا گیا تھا۔ سڑک کے اطراف ماڈرن اونچی بلڈنگز تھیں۔ سڑکوں پہ ٹریفک کا اژدھام تھا۔ تبھی معاً میری نظر ان چند لہراتی شاخوں پہ پڑی جو کسی درخت کی آخری انتہائی شاخیں تھیں۔ درخت دور کہیں نیچے اپنے پاؤں جمائے کھڑا تھا۔

''افوہ.....ادھر آؤ، دیکھو یہ کتنا خوبصورت اور نایاب درخت ہے، اسکے پتوں کا رنگ دیکھو، عنابی اور سبز..... کیسا خوبصورت لگ رہا ہے، بالکل مصنوعی سا..... یہ کسی نے بہت اہتمام اور پیار سے لگایا ہوگا۔''

''ہاں شاید۔ لیکن ہمیں تو وقت ہی نہیں کہ اسے دیکھیں۔ داہنے ہاتھ کے پردے ہم نے کبھی ہٹائے نہیں۔ سامنے کا نظارہ ہی کافی ہے.....''

''میں اس درخت کے Origin کو دیکھنا چاہوں گی۔ اس جگہ اسی مقام کو، جہاں یہ اُگا کھڑا ہے۔''

''شوق سے۔''

''اس طرف کوئی عمارت ابھی بنی نہیں۔ خالی جگہ ہے جہاں یہ درخت لگا.....'' میں اپنی سیٹ سے اٹھ چکی تھی۔ لیکن کونے کی کھڑکی سے نظارہ صاف نہیں تھا۔ صرف اسی خوبصورت درخت کے سبز پتوں کی ہوا میں اٹھکیلیاں جاری تھیں۔

''یہ کچن کی کھڑکی سے صاف نظر آئے گا۔''

''چلو کچن کی کھڑکی سے دیکھتے ہیں۔''

آخر اتنا کیا شوق چُرا گیا؟ کیا خوبی ہے اس درخت میں؟'' میرے مرحوم شوہر نے حیران ہوکر پوچھا۔

''آپ ادھر آئیں دیکھیں تو سہی۔ اس درخت کے پتے دیکھیں۔ کیسے خوبصورت رنگ اور دھاریاں ہیں ان کے اندر عنابی اور زرد رنگ کے چھینٹے سے پڑے ہیں پتوں پہ.....اوہ خدایا۔ اتنا خوبصورت درخت جیسے مصنوعی ہو۔ میں صرف دیکھنا چاہ رہی تھی کس باذوق نے اسے اپنے لان کی زینت بنایا ہے؟ اور اسے لان میں کس مقام پر لگایا ہے؟''

''واقعی.....اللہ کی شان اور قدرت کا منہ بولتا شاہکار ہے۔'' میرے مرحوم شوہر بھی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکے۔

''بھابھی جان! آپ نے ہی غور کیا ہے ہم نے تو غور سے اسے کبھی دیکھا ہی نہیں۔''

''شاید ہم سب ایسے ہی ہیں۔ کبھی کبھی بہت قریب کی چیزوں کو For Granted لے لیتے ہیں۔ غور ہی نہیں

کرتے۔''

''سب ہنس دیئے۔''

''میرا کچن کچھ اس وقت گندہ ہو رہا ہے۔''

''تو .....تو کیا ہوا.....؟'' وہ خاتون خانہ مجھے کچن میں لے جانے سے گریزاں تھیں۔'' کچن واحد جگہ ہے جو کبھی گندہ ہوتا ہے کبھی صاف۔ بار بار برتن اکٹھے ہوتے جاتے ہیں۔ شیلف گندی ہو جاتی ہے۔''

''سب گھر ایسے ہی ہوتے ہیں۔ کبھی صاف کبھی گندے۔ پلیز آپ اس بات کی بالکل فکر نہ کریں اپنے ہی گھر والی بات ہے..... میں صرف اس درخت کے لئے بے چین ہو رہی ہوں، بلکہ آیئے میں آپ کے ساتھ کچن میں کام کرواتی ہوں۔ آیئے مل کر کام کرتے ہیں..... ساتھ ہی ایک نظر میں نیچے لان پہ بھی ڈال لوں گی..... پتا نہیں Nature کی کوئی بھی خوبصورتی مجھے ہلا مارتی ہے۔ چلئے آیئے.....''

میں اور وہ آگے پیچھے چلتی ہوئی کچن میں آ گئیں میں نے اس کے ساتھ سنک میں برتن رکھوائے۔ شیلف کو صاف کرنے میں مدد دی۔ اس نے دائیں طرف بنی کھڑکی کے پٹ کھول دیئے۔ ڈل شیشوں کی وجہ سے یہاں سے نیچے کا نظارہ مفقود تھا۔ اوہ..... کھڑکی کھلتے ہی درخت کی شاخیں اپنے سے قریب محسوس ہو رہی تھیں۔ میں نے کھڑکی سے نیچے جھانکا۔ میرے ذہن میں ایک خوبصورت سا تاثر تھا۔ بہت Delicate سا تاثر..... مجھے اچانک جھٹکا سا لگا.....

''نہیں..... یہ کیا.....؟'' میری آنکھیں عجیب منظر دیکھ رہی تھیں۔ وہ ایک چھوٹے سے گندے صحن میں لگا تھا..... جو کسی بلڈنگ کا پچھواڑہ تھا، انتہائی Neglected علاقہ..... جہاں ناقابل استعمال سامان کا ڈھیر لگا تھا۔ ٹوٹے پھوٹے، میلے کچیلے فرنیچر کے پنجر پڑے تھے۔ کچھ گندی بوریاں..... پرانی پلاسٹک کی بوتلوں کا ڈھیر ایک کونے میں کھڑا تھا، پرانے لکڑی کے تختے، لوہے کا ٹوٹا پھوٹا سامان دائیں بائیں بکھرا ہوا تھا۔ اسی چھوٹے سے صحن کے ساتھ چھوٹی سی کوٹھڑی نما کمرہ تھا جہاں اسی قسم کا سامان بھرا تھا۔

اوہ خدایا! وہ نایاب درخت اس کباڑ خانے کے اندر اگا ہوا تھا جہاں اسے پانی دینے کا بھی کسی کو ہوش نہیں تھا۔ یہاں قدرت کے ہاتھ کے سوا کوئی اسکی دیکھ بھال کرنے والا نہیں تھا..... کوئی اسے سراہنے والا نہیں اور اسے چاہنے والا نہیں تھا۔، ایک تنہا، بے یار و مددگار درخت..... بے کار اشیاء کے درمیان اگا ہوا۔ شاید کسی دن یونہی سوکھ جائے گا اور کوئی اسے کاٹ ڈالے گا۔

میرا دل غم سے بھر گیا۔ بعض اوقات نادر اور نایاب لوگ بھی یونہی بدحالی کے آنگن میں اگتے ہیں، سانس لیتے ہیں اور پھر گمنام چلے جاتے ہیں..... ان پر زمانے کی ستائش کی کرن نہیں پڑتی۔ میں اداس ہو گئی تھی۔ گھر

جا کر میں نے اپنے شوہر سے کہا'' کیا ہم اس درخت کے لئے کچھ کر سکتے ہیں؟''

''مثلاً کیا؟''

''اس کے مالک سے ملیں LDA کو فون کریں اورا سے بتائیں..... وہ یہ درخت جڑ سمیت اٹھا کر کیس اچھی جگہ لگا دیں، اچھی زمین پر جہاں آتے جاتے سب اس کی خوبصورتی اور حُسن سے خوش ہوں۔''

''اچھا سوچتا ہوں۔''

بات آئی گئی ہوگئی۔

اگلی بار جب ہم دوبارہ اسی دوست کے گھر گئے تو ذکر پھر اسی درخت کا تھا۔ اس پوری بلڈنگ سے گھوم کر ہم اسی جگہ پہنچے۔ زنگ آلود لوہے کا دروازہ ہی اسی جگہ کے گندہ ہونے کا ثبوت پیش کر رہا تھا۔ ہاتھ لگاتے ہی دروازہ کھل گیا۔ اندر جھلنگا سی چارپائی پہ بوسیدہ بستر میں غالباً وہ یہاں کا چوکیدار تھا۔ سو رہا تھا۔ ہماری دستک پہ اٹھ گیا۔''خو کیا کام اے۔''

اسے ہم نے اپنے آنے کا مقصد بتایا، مالک کا اتا پتا پوچھا، درخت کی تعریف کی.....

''بی بی صاحبہ آپ اس درخت کے لئے پریشان ہیں۔ جو شاید ساتھ والے صحن میں اگا ہے۔''

''ہاں ہاں۔''

''وہ ہم قریب سے دیکھنا چاہیں گے۔''

جھلنگا سے دروازے سے باہر وہی گندہ سا صحن تھا.....

میں نے جھانکا..... وہاں اتنا کاٹھ کباڑ تھا کہ دل پریشان ہوگیا.....

''اچھا تم ایسا کرو، مالک کا فون نمبر دے دو۔ ہم اس سے درخت کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہیں۔''

''آپ ابھی جاؤ.....کل آنا، ہم مالک سے اجازت لے کر آپ کو فون نمبر دیں گے۔''

چنانچہ ہم ایسے ہی ناکام لوٹ آئے۔ تین چار دن بہت مصروفیت کے تھے۔ ہم جا نہیں پائے۔ فکر سے ہم دوبارہ پہنچے..... کمرہ لاک تھا۔ ادھر ادھر دائیں بائیں دیکھا۔ اس کا تو نام بھی ہم نہیں پوچھ سکے تھے۔ چنانچہ..... پھر پندرہ بیس منٹ دروازے پہ رک کر انتظار کیا۔ اور واپس چلے آئے.....

''اب کسی چھٹی والے دن ہی دوبارہ آئیں گے۔''

''ضرور۔''

لیکن ہفتے بعد ہی مجھے اپنی دوست کا فون آیا۔

''شاہدہ! وہ درخت تو کسی نے کاٹ دیا ہے، اسکی شاخیں مجھے نظر نہیں آ رہیں۔''

میرا دل غم سے بوجھل ہوگیا۔ دفتر سے میرے شوہر لوٹے تو میں نے ذکر کیا۔ وہ بھی ملول ہوگئے.....

''میرا خیال ہے ہمیں جانا ہوگا دیکھنے کے لئے۔''

کچھ ہی دیر بعد ہم دوبارہ اس زنگ آلود لوہے کے دروازے کے سامنے کھڑے تھے..... اندر کمرے میں تین چار لوگ موجود تھے۔ وہی چوکیدار ہمیں پہچان

کراٹھ کھڑا ہوا۔

''بولو صاحب! کیا بات ہے؟''

ہم درخت کے بارے میں پوچھنے آئے تھے۔تم نے اپنے صاحب سے ہماری بات کروانے کا وعدہ کیا تھا۔ ان کا فون نمبر تم سے مانگا تھا۔''

''خو اس گراؤنڈ کا سودا ہوگیا ہے وہ درخت نئے مالک نے اپنے لان میں لگوانے کے لیے جڑوں سمیت نکلوالیا ہے۔''

''خان تم سچ کہہ رہے ہو نا.....؟''میں نے بے چینی سے پوچھا۔وہ چپ رہا۔

پتا نہیں، سچ تھی بات یا جھوٹ تھی.....اس سیاہ کمرے میں ان کے جسموں کی بو سے دل خراب ہونے لگا تھا۔

''کہیں تم نے خود تو اس درخت کو نہیں بیچ دیا.....؟''یہ جملہ بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا تھا۔

''بیچ دیا ہے خو، ہمارا درخت تھا، پچھلے مالک کا۔اس کی لکڑی بہت قیمتی تھی۔اب ہم مالک کی بات مانتا ہے جو وہ کہے۔''

تمہیں تو ہم نے ہی احساس دلایا تھا کہ وہ بہت قیمتی درخت ہے۔کیا اس کے بعد تم نے اس کا سودا کر دیا۔''

''اوہ چلو ہمارا دماغ نہ کھاؤ..... ہاں بس بیچ دیا ہے.....اچھی قیمت مل رہی تھی، بیچ دیا۔''

''اوہ ،تو درخت اسی چوکیدار نے مزدوروں کے ساتھ مل ملا کر بطور لکڑی بیچ دیا ہے۔'' میں نے سسکتے ہوئے کہا اور آنسو میری آنکھوں سے بے ساختہ گرنے لگے تھے۔ جیسے ہمارے احساس دلانے ، اس کے کچھ کرنے کی دھن نے اسے موت سے ہمکنا کر دیا ہو۔

جیسے ایک حسینہ اچانک وڈیرے کی نظروں میں آ گئی.....اور اس نے اسے مال غنیمت سمجھ کر اچک لیا ہو.....

میں نے اپنے ٹوٹتے اعصاب کو دوبارہ بحال کرتے ہوئے پوچھا۔محض یہ جاننے کے لیے کہ شاید ہوسکتا ہے نیا مالک بہت قدر کرنے والا ہو۔ اور اسے اپنے خوبصورت لان کے ایک کونے میں جا کھڑا کیا ہو۔آج کل ٹیکنالوجی کے طفیل پورے کا پورا درخت ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جاسکتا ہے۔

''کیا نئے مالک نے اسے اپنے لان میں لگایا ہے؟''

''نیا مالک تو باہر کے ملک میں رہتا ہے۔یہ زمین اس نے ہوٹل بنانے کے لئے خریدا ہے۔اس نے بولا زمین صاف کر دو۔درخت کاٹ دو۔ام نے کاٹ دیا۔''

مجھ سے اور نہیں سنا جا رہا تھا.....

میرا بالکل وہی غم تھا..... جو کسی نایاب انسان کے دنیا کے چلے جانے پہ ہوتا ہے۔ پتا نہیں، چوکیدار کی بات میں سچ کتنا تھا اور جھوٹ کتنا.....لیکن افسوس، ہم اس نایاب و نادر درخت کے لئے کچھ کر نہیں سکے تھے۔جیسے نادر و نایاب انسانوں کے لئے جو ہمارے آس پاس ہی

ہوتے ہیں ہم بعض اوقات کچھ نہیں کر سکتے! میں دیر تک سوچتی رہی..... کیا ایسا ممکن نہیں کہ ہم خوبیوں کی قدر کرنا سیکھیں۔ خوبیوں سے بھری چیز یا انسان کو ہو سکے تو اس کے اصل مقام تک پہنچائیں، گمنامی کے اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لائیں تا کہ اس خوبی سے زمانے کو بھی فیض ملے۔ بڑے بڑے آرٹسٹک دماغ، بڑے بڑے سائنسدان، بڑے بڑے دانشور، بڑے بڑے لکھاری، بڑے بڑے موجد ہمارے درمیان پیدا ہوتے ہیں، جو ہماری بے قدری کے سبب خاموش گمنام دنیا سے چلے جاتے ہیں۔

☆☆☆

فرحت طاہر

خوابِ گُل پریشاں ہے!

پچھلے سال بلدیہ ٹاؤن کراچی میں فیکٹری میں آگ لگنے کا واقعہ اتنا دردناک تھا کہ اس پر کہانی لکھنا آسان نہیں ہے۔ یہ کہانی اب اس شہرِ نور کے ان گنت باسیوں کی کہانی ہے۔ (ف۔ط)

''فکر کی کوئی بات نہیں! یہ تبدیلی کی عمر ہے اس میں اس طرح ہوتا ہے.....'' ماہر نفسیات ڈاکٹر غزالہ نے شہلا کو تسلی دی اور کچھ ہلکی پھلکی دوائیں لکھ دیں مگر خود بھی دل میں سوچ کر ہنس رہی تھیں کہ 16 برس کی عمر تو وہ ہوتی ہے جب ہر چیز خوبصورت لگتی ہے بھلا ڈپریشن کیوں؟ Sweet Sixteen میں انسان بن پیئے مدہوش ہوتا ہے۔ کھڑے کھڑے نیند آجاتی ہے۔ یہ سمن فاطمہ تھی جسے اس عمر میں نیند نہ آنے کا عارضہ لاحق ہوگیا تھا مگر وہ کیا کرے جسے آنکھ بند کرتے ہی ڈراؤنے خواب نظر آنے لگیں اور چیخ مار کر اٹھ بیٹھے! اس فکر نے ہی ماں کو مجبور کیا کہ ماہر نفسیات سے رابطہ کرے۔ کاؤنسلنگ کے دوران عادات و ماحول اور خاندانی مسائل سے لے کر بات بچپن تک آ پہنچی۔ شادی کے پانچ سال بعد شہلا کی گود ہری ہوئی تو ہر طرف خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ باپ خوشخبری لے کر ہسپتال سے گھر جارہا تھا کہ ہنگاموں میں پھنس گیا۔ کالج کی طالبہ (بشریٰ زیدی) بس کے نیچے آکر کچلی گئی تو جلاؤ گھیراؤ شروع ہوگیا۔ جلتی ہوئی بس سے اترنے کوشش میں حیدر علی زخمی ہوا شکر ہے جان تو بچی!

ادھر ہسپتال میں بیوی اپنی نوزائیدہ بچی کے ساتھ سولی پر لٹکی رہی اتنے ارمانوں، دعاؤں سے پیدا ہونے والی بچی کا استقبال کیا عالیشان ہوتا جب باپ موت وزیست کی کشمکش میں مبتلا ہو اور روزگار داؤ پر ہو تو یہ سب خواب محسوس ہوتا ہے۔ بے چاری شہلا خود آرام کیا کرتی، الٹا زخمی شوہر کی تیمارداری میں لگ گئی شکر ہے کہ نام کا تحفہ پہلے ہی دیا جاچکا تھا، سمن فاطمہ! شاید اس کی کشش تھی کہ باپ تیزی سے روبصحت تھا۔

وقت اچھا ہو یا برا گزر ہی جاتا ہے۔ سمن خوشیوں کے ہنڈولے میں پرورش پارہی تھی۔ اس کی خوبصورتی، ذہانت، خوش اخلاقی اور مستعدی ہر ایک کو مسکرانے پر مجبور کردیتی۔ اب وہ دو سال کی ہونے والی تھی۔ الفاظ تو بہت پہلے سے بولتی تھی مگر اب جملے بولنے کی کوشش کرنے لگی تھی۔ ان ہی دنوں حالات پھر تیزی سے خراب ہونے لگے تھے اور پھر ایک واقعے نے اشتعال کا رنگ پکڑ لیا تھا۔ شادی ہالز کے باہر سے دو بہنیں اغوا ہوگئیں جن کی لاشیں انتہائی ناگفتہ بہ حالات میں ملیں۔ ان کے بعد فسادات شروع ہوگئے۔ پریشان حیدر علی گھر پہنچا تو

بیوی نے سکون کا سانس لیا اور ننھی سمن باپ کی گود میں چڑھ گئی اور ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں بولنے لگی۔.....

''بابا.....! شادی میں نہیں جانا مر جاتے ہیں.....''

اس جملے کی تکرار سن کر ماں باپ ششدر رہ گئے۔ سمن نے اپنا جملہ بولا بھی تو کیا؟؟ پریشانی، خوف اور بے اطمینانی، بدامنی میں ڈوبا ہوا! جس کے پور پور سے تشویش عیاں تھی۔

وقت گزرے کے ساتھ جیسے سمن بڑی ہو رہی تھی اس کی حساسیت پریشان خیالی میں بدلتے جا رہی تھی۔ حالات کی کشیدگی شہر میں ہو یا ملک میں یا دنیا کے کسی بھی کونے میں ہونے والی امن وامان کی غیر محفوظ صورتِ حال اس کی بے چینی میں اضافہ کا باعث بن جاتی۔ اب وہ میٹرک کی طالبہ تھی۔ افغانستان پر امریکی حملے کے بعد پوری دنیا خصوصاً خطے کے لوگ خطرات کی زد میں تھے۔ بہت کچھ یقین دہانیوں کے باوجود سمن کی بے قراری کم نہ ہوتی۔ ماں پریشان ہو کر بالآخر ڈاکٹر غزالہ کے پاس آ پہنچیں مگر بہت احتیاط کے ساتھ کہ کسی کو معاملے کی بھنک نہ ملے۔

مستقل کاؤنسلنگ اور ذہنی مشقتوں کے بعد سمن نارمل ہوتی جا رہی تھی۔ صحت بحال ہوئی رنگ روپ دوبارہ کھل اٹھا۔ ابھی انٹر میں آئی تھی کہ رشتوں کی لائن لگ گئی مگر وہ بچپن سے ہی پھپھو کے بیٹے سعد کی منگیتر تھی۔ سیکنڈ ائر کے امتحانات سے فارغ ہوئی ہی تھی کہ دلہن بن کر رخصت ہوگئی۔ زندگی کے اس خوبصورت موڑ پر سمن اس آسیب سے گویا باہر آ گئی تھی۔ اور اپنے اندر نئی زندگی کا وجود پا کر تو جیسے قوس وقزح کھلنے لگی تھی اور پھر وہ دن آ پہنچا جب دنیا کا مقدس ترین رشتہ عطا ہوا۔ وہ ایک ٹک اپنی گڑیا کو دیکھے جا رہی تھی۔ ریحا تھی بھی اتنی پیاری، سمن کا بچپن صاف جھلک رہا تھا۔

ایک ماہ کی ریحا کو لے کر سمن اور سعد کشمیر روانہ ہوئے تاکہ سیر وسیاحت کے علاوہ عید اپنے آبائی علاقے میں منا سکیں۔ ابھی انہیں یہاں پہنچے ہفتہ ہی ہوا تھا کہ پورے علاقہ میں شدید ترین زلزلہ آ گیا۔ سمن اپنی بچی کو سینے سے چمٹائے کھیتوں میں ننگے پاؤں اور سر کھڑی تھی۔ سعد کو دیکھتے ہی اس سے لپٹ کر بے ہوش ہوگئی۔ ریلیف کے کاموں کا آغاز ہوا تو واپس کراچی آ گئے۔ گھر پہنچ کر سمن ایسی بے سدھ ہوئی کہ ماں باپ اس کی طرف سے ایک بار پھر مایوس ہونے لگے۔ دوبارہ علاج شروع ہوگیا۔

وقت بڑا مرہم ہے اور موت کا خوف بھی لوگوں کے دل سے کم ہونا شروع ہوگیا تھا۔ اور سمن بھی بہتر ہوتی چلی گئی۔ اور اپنی ریحا کو دیکھ کر تو جیسے اس کو نئی زندگی مل جاتی تھی۔ ریحا اب پورے دو سال کی ہو رہی تھی۔ اس کی پرورش کے ساتھ ساتھ اب تعلیم کی طرف بھی دھیان ہونے لگا تھا۔ سمن ہر ایک سے اس معاملے میں مشورہ کرنے لگی تھی۔ کبھی اس کا دل چاہتا کہ اپنی بیٹی کو حافظہ بنائے۔ کبھی ڈاکٹر! کبھی ٹیچر، وہ خود ہی اپنی سوچوں میں مسکرا دیا کرتی تھی۔

انہی دنوں اسلام آباد کے ایک مدرسے میں ایسا معرکہ ہوا کہ انسانیت ششدر رہ گئی۔ معصوم بچیاں فاسفورس سے راکھ بنادی گئیں۔ وہ ایسا دن تھا کہ سمن پر ایک بار پھر وہی دورہ پڑا۔ ماں باپ کو سنبھالنا مشکل ہوگیا۔ سعد بھی بہت پریشان تھا۔ بیوی کی حساسیت اتنی بڑھ چکی تھی کہ اسے لمحے بھر کی دیر ہوتی تو خوف سے زرد پڑ جاتی۔ کہیں بم دھماکہ، کہیں خودکش حملہ، کہیں جلاؤ گھیراؤ!!

چینلز کی بھرمار کی وجہ سے ایسے واقعات کی تشہیر بھی بہت زیادہ ہونے لگی ہے۔ چنانچہ اس کی پریشانی دوچند ہوگئی ہے۔ اخبارات کا داخلہ بند کروایا، کیبل کنکشن کٹوایا، مگر موبائل سے اطلاع کی فراہمی روکنا ممکن نہیں!! اور ہے بھی آج کل کے حالات میں رابطے کا ذریعہ!! چنانچہ سمن کو ہر وقت ایک ڈوز دیتے دیتے وہ تھک سا گیا ہے۔ ادھر حالات ہیں کہ مخدوش سے مخدوش ہوتے جارہے ہیں۔ اب سمن کی ساری بے قراری ریحا میں منتقل ہوچکی ہے۔ معصوم سی بچی کسی سے بات کرے گی تو پہلے سوال کرے گی۔

''آپ کی طرف حالات ٹھیک ہیں.....؟؟''

جو سنتا ہے اس بات پر مسکرا اٹھتا ہے مگر ایک تکلیف کے ساتھ! اس جملے میں چھپا درد اس شہر پریشان میں رہنے والا ہر فرد خوب محسوس کرتا ہے۔

آج بھی صبح وہ کام پر جانے کے لئے نکلنے لگا تو پہلے بیوی اور پھر بچی کو تسلی دی۔

''میں فیکٹری پہنچ کر فون کروں گا، اور ہاں بیٹا تیار رہنا، آج بابا کو تنخواہ ملے گی تو شاپنگ کو چلیں گے۔ آپ اسکول جاؤ، شام کو سالگرہ بھی تو ہے ہماری بیٹی کی.....''

سعد نے بیٹی کو اسکول روانہ کیا اور خود فیکٹری جانے کے لئے تیار ہونے لگا۔ حسب معمول فیکٹری پہنچ کر خیریت کا فون کیا مگر اس کے بعد مصروفیت کے باعث رابطہ نہ کرسکا۔ سمن بھی اطمینان کے ساتھ شام کی تیاریوں میں مشغول تھی۔ ریحا کو بہلاتے بہلاتے وہ تھک گئی تھی سعد ابھی تک نہ واپس آیا تھا۔ اسی وقت ابو کا فون آیا وہ تشویش کے عالم میں سعد کا پوچھ رہے تھے..... اور پھر قیامت ٹوٹ پڑی گویا.....

''فکر نہ کرو! میں بہت جیوں گا! میری کوئی لاش واش حادثے کا شکار ہوکر گھر نہ آئے گی.....''

اس کی یہ بات تو پوری ہوگئی۔ لاش کیا گھر آتی؟ راکھ تو بن گیا تھا سب کچھ!!

سمن خوف سے زرد پڑتی ریحا کو دیکھ رہی تھی اور اپنے عمر بھر کے خوف کو ایک حقیقت بنتے دیکھ کر سوچ رہی تھی۔

''کیا میری پریشان خیالی میری بچی کی محرومی میں ڈھل گئی ہے!!'' ریحا کو سینے سے چمٹاتے ہوئے اس نے اس سفر کے بارے میں سوچا جس کی آبلہ پائی شاید سعد کے تپش میں گھرے جسم سے کسی طرح کم نہ تھی!!

☆☆☆

فرحی نعیم

مداخلت

''یہ کیا ہے؟'' درخشاں آنٹی نے ممی کی طرف پلٹ کر حیرت سے پوچھا اور جواب میں ممی شرمندہ ہوگئیں۔ ''بس رخشی تمہیں تو سنی کی عادت کا معلوم ہی ہے وہ تو ہمیشہ سے.....''

''لیکن تمہارے گھر میں لوگ کتنے ہیں جو یہ لگایا گیا ہے۔'' انہوں نے دروازے کے باہر لٹکے کارڈ پر طنزیہ اشارہ کیا تھا اور ممی اس بار بھی گڑبڑا کر رہ گئیں۔

''اصل میں اسے کچھ الگ تھلگ رہنے کی عادت پڑ گئی ہے تو اسی لیے۔'' ممی جواز پیش کر رہی تھیں۔

''تو تم کچھ نہیں کہتیں؟''

''کیا کہوں اس کے شوق کے آگے میں بھی چپ کر جاتی ہوں۔''

''نقصان اٹھاؤ گی یاد رکھنا۔'' انہوں نے چبا چبا کر کہا اور ممی تو رخشی آنٹی کے اس طرح کہنے سے دہل کر رہ گئیں۔

''خدا نہ کرے۔'' بے ساختہ ہی ان کے منہ سے نکلا تھا۔

''اب کیا واپس چلے جائیں؟'' لہجہ سوالیہ تھا تو الفاظ تیر کی مانند، ممی کے پاس جواب نہ تھا۔

''چلو۔'' تبھی رخشی آنٹی نے اپنے دائیں بائیں کھڑے بیٹا، بیٹی کو بغیر دیکھے مخاطب کیا اور تنی ہوئی کیفیت میں دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔ اور ممی.....، وہ اپنی ہی نظروں میں شرمندہ ہو چکی تھیں چند لمحے وہ دروازے پر لٹکے اس کارد کو دیکھتی رہیں جس پر بڑی خوبصورتی سے تحریر کیا گیا تھا لیکن وہ الفاظ..... پھر وہ تھکی تھکی سی اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئیں تھیں۔

''یہ اولاد بھی کیا چیز ہے اور اس کی محبت، آج مجھے رخشی کے سامنے شرمندہ کروادیا۔ تو اس دن فاروق بھائی کتنا ناراض ہو کر گئے تھے تو اس سے پہلے زبیر چاچا، اُف سنی تم کیوں نہیں سمجھتے۔'' وہ آپ ہی آپ سنی کو سمجھا رہی تھیں لیکن یہاں اس خالی کمرے میں ان کے سوا کوئی نہ تھا۔ خاصی دیر کے بعد سنی کے اسٹوڈیو کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ انہیں ڈھونڈتا کمرے کی طرف آ گیا۔

''آپ یہاں بیٹھی ہیں میں آپ کو اس طرف.....''

تو کیا کروں میں وہاں اکیلی بیٹھ کر۔'' وہ بے

ساختہ تیزی سے بولیں تھیں۔ ''کتنی دفعہ کہا ہے کہ کوئی مہمان آجائے تو باہر آجایا کرو۔ تھوڑا مل جل کر بیٹھو، ہنسو بولو لیکن تم تو.....'' امی کے منہ سے غصہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

''آج کون آ گیا؟'' وہ لاپروائی سے بولا۔

''رخشی!'' ممی نے اپنی بہن کا نام لیا۔

''اوہ! رخشی آنٹی، حسب معمول ناراض ہو رہی ہوں گی۔'' سنی کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ آ گئی تھی۔

''تو کیا نہ ہوں؟'' ممی نے غصہ سے اسے دیکھا۔

''ارے ممی آپ لوگوں کی پروا نہ کیا کریں''

''تو کیا صرف تمہاری پروا کروں، جو کہ آج تک کرتی آ رہی ہوں۔'' وہ لاچاری سے بولیں۔ آخری جملہ انہوں نے آہستہ آواز میں بولا تھا لیکن سنی نے سن لیا تھا۔

''اوہ ممی آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں، چلیں آئیں دیکھیں میں نے کتنی زبردست تصویر تیار کی ہے۔ آیئے نا۔'' وہ انہیں بازو سے اٹھاتا ہوا بولا اور پھر اپنے ساتھ لگائے اپنے اسٹوڈیو روم میں لے گیا۔ ''یہ دیکھیں کیا دلکش منظر ہے۔'' وہ انہیں اپنی تازہ بنی ہوئی تصویر دکھانے لگا۔

''ہوں۔'' انہوں نے تصویر کو غور سے دیکھا، اگرچہ اس میں بڑی مہارت سے ڈوبتے سورج اور اس سے متعلقہ دوسرے مناظر پینٹ کیے گئے تھے، جس میں مایوسی اور ناامیدی کا عنصر بڑا واضح تھا لیکن چونکہ اس وقت وہ سخت دلبرداشتہ ہو رہی تھیں لہٰذا انہوں نے اس خاص تصویر کو کوئی خاص اہمیت نہ دی۔

''کیسی لگی؟'' سنی پوچھ رہا تھا۔

''ہاں بہت اچھی۔'' انہوں نے زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے کہا تب اس نے ان کی کیفیت بھانپ لی۔

''ممی! آپ خود سوچیں میں اس تصویر کو فائنل ٹچ دے رہا تھا۔ میری پوری توجہ اسی میں تھی، اب ایسے موقع پر اگر کوئی مجھے ڈسٹرب کرتا تو کیا ہوتا۔ میری تو اتنی محنت سے تیار ہوئی تصویر، بے جان ہو جاتی۔''

''ہاں بیٹا! ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' انسانوں سے زیادہ تصویریں اہم ہیں۔ انہوں نے تلخی سے سوچا اور کمرے میں ہر طرف بکھرے برش، رنگوں اور دوسری متعلقہ چیزوں کو دیکھتے ہوئے بولیں ''کس قدر پھیلاتے ہو، نذیر سے کہو انہیں سمیٹے۔''

''سمٹ جائے گا سب کچھ، چلیں ایسا کرتے ہیں کہ مل کر مزیدار سی چائے پیتے ہیں اور آج چائے میں خود بناؤں گا۔''

''ارے رہنے دو تم کہاں کچن میں جاؤ گے میں رشیدہ سے کہہ دیتی ہوں۔''

''نہیں آج تو میں خود بناؤں گا اور پھر وہ جلد ہی دو کپ چائے لے آیا، ساتھ میں جھٹ پٹ سینڈوچ بھی تیار کر کے لے آیا اور پھر ماں بیٹوں نے مل کر

چائے لی، تب کہیں جا کر امی کا موڈ بحال ہوا۔ تبھی انہیں کچھ خیال آیا۔

''تم ڈاکٹر کے پاس گئے؟''

''اوہ! جی چلا جاؤں گا۔''

یہ بات تم مجھے پچھلے ایک ماہ سے کہہ رہے ہو اب تم چھوٹے سے بچے تو ہو نہیں کہ پکڑ کر لے جاؤں تم کو خود اپنی صحت کا خیال رکھنا چاہیے۔'' امی خفگی سے کہہ رہی تھیں۔

''جی بس آئندہ ہفتے کسی دن ٹائم نکال کر جاتا ہوں۔''

''آئندہ ہفتے!! اسی ہفتے بلکہ کل ہی کیوں نہیں؟''

''نہیں آج کل تو میں بہت مصروف ہوں۔ بہت سا کام کرنا ہے اور بہت کچھ مکمل بھی کرنا ہے۔ پھر آپ کو معلوم ہے اگلے مہینے اسلام آباد میں نمائش ہے۔ وہاں کے لئے بھی.....''

''یہ نمائش ایک طرف لیکن پہلے اپنی صحت۔'' امی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''جی، جی بالکل۔'' اس نے تیزی سے سر ہلایا۔

لیکن حسب معمول وہ اپنی بے تحاشہ مصروفیت میں ڈاکٹر کے پاس نہ جا سکا۔ ممی کے کئی دفعہ کہنے کے باوجود بھی آج اور کل میں ٹالتا رہا اور یوں اس کی نمائش کے دن قریب آ گئے اور وہ عازم سفر ہوا، اور ممی اس کے پیچھے مزید اکیلی ہو گئیں۔

☆.....☆.....☆

سہیل احمد، جسے ممی پیار سے سنی کہتی تھیں ایک مشہور مصور تھا۔ اس کے دن کا زیادہ حصہ اپنے اسی شوق کی نذر ہو جاتا۔ شروع شروع میں تو وہ صرف شوقیہ ہی یہ کام کرتا تھا لیکن آہستہ آہستہ جب اس کی تصویریں لوگوں میں مقبول ہونے لگیں ساتھ ہی وہ خود بھی لوگوں میں پسند کیا جانے لگا بہت جلد وہ قبولیت عامہ کا درجہ حاصل کر گیا تھا۔ جسے وہ خدا تعالیٰ کی مہربانی ہی سمجھتا تھا۔ اس کی تصویریں ہاتھوں ہاتھ نکلتی تھیں۔ ہر چند ماہ بعد بڑے پیمانے پر اس کی نمائش کا انعقاد ہوتا۔ اپنی اسی مقبولیت کے سبب اب وہ حد درجے مصروف رہنے لگا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ کسی کو بھی وقت نہ دے پاتا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنا کام اس قدر انہماک کے ساتھ کرتا کہ اس میں کسی کی بھی مداخلت اس کے لیے ناقابل برداشت ہوتی۔ حد تو یہ کہ وہ کبھی کبھی تو ممی کا اپنے اسٹوڈیو میں بلا اجازت آنا بھی پسند نہ کرتا تھا کجا کہ پھر ملازم، جو گھر میں تقریباً آدھا درجن تھے۔ وقت، بے وقت کی ٹیلی فون کالز بھی اسے پسند نہ تھیں اسی لیے سب کو اس نے ایک مخصوص ٹائم دے دیا تھا کہ اس کے علاوہ وہ اپنا سیل بند ہی رکھتا۔ اس کی اجازت کے بغیر کوئی بھی اسٹوڈیو میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ کبھی کبھی ممی گھنٹوں کمرے میں بند رہنے سے گھبرا کر کسی ملازم کو مختلف بہانوں سے بھیجتی تھیں کہ کم از کم کھانے پینے کا ہی پوچھ

لے جس پر ملازم کو تو ڈانٹ ہی پڑتی ساتھ ممی سے بھی درخواست کی جاتی کہ اسے ڈسٹرب نہ کیا جائے اگر اسے کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو وہ خود ہی کسی کو آواز دے لے گا۔لیکن وہ اپنی مامتا سے مجبور رہتیں جس کا حل اس نے دروازے پر ایک کارڈ لٹکا کر کیا جس پر بڑے واضح طریقے سے ''ڈونٹ ڈسٹرب'' لکھ دیا۔ اب جب وہ کارڈ لٹکا ہوتا کسی ملازم کی مجال نہ تھی کہ اس کمرے کا رخ بھی کرتے حتیٰ کہ ممی بھی پھر اجتناب ہی کرتیں۔انہوں نے اس کے جنون کو دیکھتے ہوئے سمجھوتہ کرلیا تھا لیکن آنے والے مہمان کارڈ کو دیکھ کر سخت برا مناتے۔جس پر ممی شرمندہ ہو ہو جاتیں۔

اور آج بھی یہی ہوا تھا۔رخشی آنٹی ممی کی بہن تھیں۔آج کئی ماہ بعد وہ اپنے بچوں کے ساتھ خاص طور پر اس سے ملنے آئیں تھیں کتنی دیر تو وہ ممی سے باتیں اور اس کا انتظار کرتی رہیں لیکن جب دو گھنٹے بعد بھی وہ اپنے اسٹوڈیو سے باہر نہ نکلا تو انہوں نے اس سے وہیں ملاقات کا ارادہ کر کے اسٹوڈیوں کا رخ کیا لیکن باہر کارڈ لٹکا دیکھ کر وہ تلملا ہی تو گئیں تھیں اور ممی کے آگے بھڑاس نکال کر چلی گئی تھیں۔

اسلام آباد سے واپسی پر دو دن تک تو وہ تھکن اتارتا رہا۔اس کا ایک ہفتہ کا دورہ بڑا کامیاب رہا تھا۔ پھر انہوں نے دوبارہ سے اسے ڈاکٹر کے پاس چلنے کا اصرار کیا تھا۔

''اوہ، ممی میں آپ کو بتانا بھول گیا، میں نے وہاں ڈاکٹر کو دکھا دیا تھا۔''

''بہرحال تم نے وہاں دکھا دیا اچھا کیا لیکن اب میری تسلّی کے لئے یہاں بھی ڈاکٹر سعید کو دکھا دو۔''

''اوکے، اوکے۔'' اس نے حسب معمول ان کو بہلایا تھا۔

اور یہ بھی حقیقت تھی کہ اسے وہاں تو بالکل وقت نہ ملا تھا۔ایک تو ایگزیبیشن کی مصروفیات، پھر لوگوں سے ملنا ملانا۔ دعوتیں ، پارٹیاں۔ کہاں یہ ہفتہ گزرا اسے معلوم ہی نہیں ہوسکا اور ویسے بھی اسے اپنی صحت کی کوئی پروا بھی نہیں تھی۔اور وہاں اسے صحت کی کوئی پرابلم بھی نہ ہوئی۔ صبح جو ہوٹل سے نکلتا تو رات ہی گھستا۔اب تو ملے جلنے والے اس سے شادی کا کہتے جس کا جواب یہی ملتا کہ ''میرے پاس تو اپنے لیے ٹائم نہیں شادی کے لئے کیسے وقت نکالوں۔'' ممی الگ کہہ کہہ کر تھک چکی تھیں۔لیکن وہ توجہ کب دیتا۔

''سنی ! آج فاروق انکل نے بلایا ہوا ہے۔ یاد ہے نا۔''

''آج، آج تو.....''

''دیکھو اپنی کسی مصروفیت کا نام نہیں لینا میں نے اس لنچ کا تمہیں ایک ہفتے قبل ہی بتا دیا تھا بلکہ فاروق انکل نے تم سے پوچھ کر آج کا دن اور وقت طے کیا تھا۔'' ممی اسے یاد دلا رہی تھیں۔

''اُف ممی اول تو مجھے یاد ہی نہیں رہا اور دوسرا یہ کہ آج تو مجھے یہ تصویر ہر حال میں پوری کرنی ہے۔

رات تک وہاں پہنچانی ہے۔''

''پھر مزید ناراضگی سہوں۔'' وہ ہونٹ بھینچتے ہوئے بولیں۔

''ممی پلیز آپ تو میری مجبوری سمجھتی ہیں نا، اور پلیز اب مجھے کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔'' وہ اپنے اسٹوڈیو کی طرف جاتے ہوئے بولا۔

''ہم اگر تھوڑی دیر کے لئے چلے چلتے تو .....'' ممی نے ایک راہ سجھائی۔

''امپوسبل، میرا آج جانا ممکن ہی نہیں۔''

اور آخر ممی خود ہی فاروق انکل کے ہاں چلی گئیں، باتوں میں کتنا ہی وقت گزر گیا پتہ ہی نہ چلا۔ آخر سات بجے تک وہ واپس گھر آ گئی تھیں۔ پورچ میں سنی کی گاڑی کھڑے دیکھ کر انہیں تعجب ہوا کہ اسے تو بہت ضروری جانا تھا تو کیا سنی واپس بھی آ چکا ہے۔ اندر پہنچ کر انہوں نے ملازم سے معلوم کیا تو انہوں نے یہی کہا کہ صاحب تو سارا دن کمرے سے ہی باہر نہیں نکلے۔

''کھانا، چائے وغیرہ کچھ لیا یا یونہی، کم از کم پوچھ ہی لیتے۔'' اب انہیں فکر ہوئی۔

''بیگم صاحبہ، صاحب کے کمرے کے باہر کارڈ لٹکا ہوا ہے۔'' نذیر نے کہا اور وہ خاموش ہو گئیں کیا کہتیں۔ اس سے پہلے ایک دو دفعہ نذیر ان کے کہنے پر دروازے پر دستک دینے اور اسے ڈسٹرب کرنے کا جرم کر چکا تھا جس پر اس نے اس بے جا مداخلت پر اسے سخت ڈانٹ پلائی تھی۔

کام کے دوران کسی بھی قسم کا خلل اسکے لئے نا قابل برداشت ہو جاتا تھا۔ اسکی ساری توجہ اور ارتکاز ٹوٹ جاتا جس کا نتیجہ پھر ملازموں کو اس کے غصہ کی صورت میں برداشت کرنا پڑتا۔ اور اب تو کوئی بھی بھول کر اس طرف کا رخ نہ کرتا جب دروازے پر کارڈ لٹکا دیا جاتا، چاہے کتنے ہی گھنٹے گزر جائیں۔ اور آج بھی یہی ہوا تھا۔ وہ ممی کے فاروق انکل کے گھر جانے سے کئی گھنٹے پہلے سے ہی کمرے میں بند تھا۔ جاتے جاتے ممی نے دروازے پر دستک دے کر اسے مطلع کر دیا تھا کہ وہ جا رہی ہیں اس نے سر ہلا دیا تھا اور دوبارہ سے اپنے کام میں منہمک ہو گیا تھا۔

ممی نے تھوڑی دیر تو انتظار کیا لیکن پھر ان سے برداشت نہ ہو سکا اور انہوں نے گھبرا کر دستک دے ڈالی تھی۔ دل میں عجیب قسم کے وہم آ رہے تھے۔ وہ اپنے اندر بے چینی سی محسوس کر رہی تھیں۔ دوسری دستک پر بھی دروازہ نہ کھلا تو انہوں نے بے اختیار ہی اسے زور زور سے آوازیں دینی شروع کر دی تھیں۔ نذیر اور ظہیر بھی گھبرا کر آ گئے تھے اور انہوں نے اسے آوازیں دیں تھیں پھر وہ دوسری طرف سے کھڑکی کی جانب گئے لیکن وہاں سے بھی آوازیں دینے کے باوجود کوئی جواب نہیں آ رہا تھا۔

''بیگم صاحب اگر آپ کہیں تو دروازہ توڑ دیں'' نذیر نے کافی آوازیں دینے بعد ان سے اجازت

مانگی۔

''ہاں ،ہاں توڑ دو ،جلدی کرو۔'' انہوں نے کپکپائی آواز میں کہا تھا۔

''رشیدہ۔تم جلدی سے فاروق بھائی اور اکبر بھائی کو فون کرو،ان سے کہنا کہ.....'' مگر اس سے آگے ممی سے بولا ہی نہیں گیا۔ وہ زیرلب دعائیں کررہی تھیں لیکن الفاظ لڑکھڑا رہے تھے۔

دروازہ کافی کوششوں کے بعد کھلا تو اندر کا منظر سب کے لیے بہت اذیت ناک تھا۔سنی اوندھے منہ گرا ہوا تھا۔اسکے آس پاس رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ نذیر اور ظہیر نے تیزی سے اندر جا کر اسے سیدھا کیا، اس کا چہرہ تھپتھپایا آوازیں دیں لیکن کوئی جواب نہ تھا۔ممی کی ٹانگیں لرز رہی تھیں ان کا دل کسی انہونی کی خبر دے رہا تھا، آنسو ایک تواتر سے ان کے چہرے کو بھگو رہے تھے۔ وہ سنی کو آواز دینا چاہتی تھیں، لیکن آواز ان کے حلق میں پھنس چکی تھی۔ فاروق بھائی آچکے تھے اور یہ غیر متوقع صورتحال دیکھ کر انہوں نے فوراً ہی ایمبولینس کے لیے فون کر دیا تھا۔

جلد ہی ایمبولینس آ گئی تھی۔سنی کو اسٹریچر پر ڈال کر ہسپتال لے جایا گیا۔گھر میں کئی رشتہ دار اطلاع ملتے ہی آچکے تھے۔ رخشی آنٹی اور دیگر عزیز ممی کو سنبھال رہے تھے۔لیکن ان کے منہ سے ''سنی میرا بچہ، کیا ہو گیا اسے۔'' کے الفاظ تواتر سے نکل رہے تھے۔ اور پھر جلد ہی یہ اندوہناک خبر آئی کہ سنی اب اس دنیا میں نہیں۔اور ممی کے لئے تو یہ خبر بجلی بن کر گری تھی۔وہ تو سنتے ہی حواس کھو بیٹھی تھیں۔ ڈاکٹر کی رپورٹ کے مطابق اس کو چند گھنٹے پہلے شدید قسم کا ہارٹ اٹیک ہوا تھا جو کہ جان لیوا ثابت ہوا تھا۔ ڈاکٹر کے اندازے اور کمرے کے حالات دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا تھا کہ اس کو اٹیک ہوا تو اس نے اٹھنے اور آوازیں دینے کی کوشش کی تھی لیکن آواز اتنی اونچی نہیں تھی کہ باہر جا سکتی ۔اس کی لاش بھی دوازے سے تھوڑے فاصلے پر تھی جس کی وجہ سے کہا جا سکتا تھا کہ اس نے اٹھ کر باہر آنے کی کوشش کی ہوگی لیکن اسے مہلت نہ مل سکی۔ دروازے پر لٹکا ''ڈونٹ ڈسٹرب'' کے بورڈ کی وجہ سے کسی ملازم میں جرأت نہ تھی کہ وہ کمرے کے قریب بھی پھٹکتا جس کی وجہ سے کسی کو فوری طور پر علم ہی نہ ہوسکا اس حادثہ کا۔

''ڈونٹ ڈسٹرب'' کے الفاظ اسے انسانوں کی مداخلت سے تو بچا گئے لیکن اجل سے نہ بچا سکے۔

☆☆☆

ڈاکٹر بشریٰ تسنیم

ہم کہ ٹھہرے اجنبی

شارجہ کورنیش پہ ایک بلڈنگ میں اس صبح بہت دیر سے ایک لفٹ کسی منزل پہ رکی ہوئی تھی۔ دوسری لفٹ اوپر جانے والوں کے ہاتھوں میں تھی ..... نیچے جانے والے لوگ اکٹھا ہوتے جا رہے تھے۔ کوئی پانچ منٹ میں اوپر جانے والی لفٹ ساتویں منزل پر واپس آ کر رکی تو سب لفٹ میں داخل ہونے میں پہل کرنے کی کوشش میں تھے۔ زیادہ مرد تھے تو صائمہ اور ایک اور خاتون باہر ہی کھڑی رہ گئیں۔

''مردوں کو لیڈیز فرسٹ والا اصول اب بھول گیا ہے۔'' صائمہ نے رنجیدہ ہو کر کہا۔

ہلکے نیلے رنگ کی ساڑھی میں ملبوس پچاس پچپن کے لگ بھگ دوسری خاتون نے نوعمر صائمہ کو مسکرا کر دیکھا اور تسلی آمیز لہجے میں بولیں:

''وہ تعداد میں جیادہ تھے..... زمہوری دور ہے نا!''

صائمہ نے ان بنگالی خاتون کی بات پر سر ہلا کر تائید کی۔

''آنٹی! آپ آیئے نا! ہماری طرف، میری امی آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔ آپ کون سے فلور پہ رہتی ہیں؟'' باتونی صائمہ کو خیال آیا کہ شاید وہ یہاں نہ رہتی ہوں..... کسی کو ملنے آئی ہوں۔

''میں نیچے تیسرے فلور پہ رہتی ہوں۔''

''اچھا!'' صائمہ نے سوچا میری امی کی ہم عمر ہیں ان سے دوستی کرواتی ہوں وہ ہر وقت گھر میں اکیلی رہتی ہیں۔

''آنٹی کیا نمبر ہے آپ کے فلیٹ کا؟ میں امی کو لے کر آپ کے پاس آؤں گی۔''

''تین سو تین۔'' بنگالی لہجہ میں خاتون نے جواب دیا۔

اسی اثنا میں لفٹ آ گئی ..... دونوں نے لفٹ میں داخل ہو کر ایک دو جملوں کا تبالہ کیا تھا کہ تیسرا فلور آ گیا۔

''آنٹی! اللہ حافظ'' صائمہ نے خوش دلی سے خاتون کو الوداع کہا۔

صائمہ پاکستان سے حال ہی میں کامرس کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد شارجہ کی ایک پرائیویٹ کمپنی میں ملازمت کر رہی تھی۔ شام کو جب وہ گھر واپس آئی تو لفٹ میں داخل ہوتے ہی اس کو صبح والی خاتون یاد آ گئیں۔ اپنے فلیٹ میں داخل ہوتے ہی اس نے حسب عادت آواز لگائی۔

''السلام علیکم! امی جان! میں آ گئی۔''

فلیٹ کون سا کوئی بڑی جگہ ہوتی ہے نہ صحن، نہ برآمدہ، پلک جھپکتے میں وہ ماں کے کمرے میں موجود تھی۔

''امی! آج مجھے ایک آنٹی ملی تھیں۔ میں نے ان سے کہا ہے کہ میری امی آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔ آپ ان سے دوستی کر لیں۔ سارا دن بور ہوتی رہتی ہیں۔'' بائیس سالہ صائمہ کا انداز گفتگو ابھی بھی بچوں والا تھا۔

صائمہ کی ماں عاکفہ نے بستر سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

''کہاں کی ہیں؟''

''بنگلہ دیش کی۔''

''مجھے بنگالی لوگ نہیں بھاتے، تمھیں پتہ تو ہے، میں نے تو کبھی کام والی بھی نہیں رکھی بنگالی۔''

''کیوں؟'' صائمہ ایک دم بجھ سی گئی۔

''ایک تو وہ اردو کی ٹانگ کیا سب کچھ توڑ پھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔''

''امی! یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔'' صائمہ ناراض ہی ہوگئی اور کچن میں جاتی ماں کو رنجیدہ نظروں سے دیکھتی رہی۔ اس کو واقعی اپنی ماں کے رویے سے بہت تکلیف ہوئی تھی۔

صائمہ بجھے دل سے اپنے کمرے میں گئی اور بستر پر بیگ پھینک کر خود لباس بدلنے کے لیے الماری میں لٹکتے کپڑوں کو دیکھنے لگی۔

''امی! کون سے کپڑے پہنوں۔'' اس نے وہیں سے آواز لگائی، مگر ماں کی طرف سے کوئی آواز نہ آئی۔ نہ مشورہ، نہ ہی ڈانٹ۔

ابھی تک صائمہ، کپڑوں کے انتخاب میں ہمیشہ متردد رہتی تھی۔ دو چار کپڑے ہوں تو اس معمولی سے کام میں اتنا دماغ اور وقت خراب نہ ہو ماں کی طرف سے اکثر یہ جملہ سننے کو ملتا۔

اس وقت ماں کی طرف سے خاموشی نے صائمہ کو احساس دلایا کہ وہ کچھ زیادہ ہی ناراض ہوگئی ہیں۔ اس نے پھولدار کاٹن کا گھیر والا فراک اور چوڑی دار پاجامہ نکالا، جو استری شدہ تیار تھا اور پہن کر باورچی خانے میں ماں کے پاس آ گئی۔ وہ رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف تھیں۔

''امی! آج کیا بنایا ہے۔''

''دیکھ لو۔'' مردہ سی آواز جس سے گریہ کا شائبہ ہوتا تھا۔

''امی! آپ اتنی ناراض کیوں ہوگئی ہیں۔'' صائمہ نے ماں کے کندھے پہ سر رکھتے ہوئے کہا۔

''میں ناراض کب ہوں۔''

''پھر کیا ہیں؟''

''اداس ہوں۔''

''اس اداسی کا بنگالی لوگوں سے کیا تعلق ہے؟''

''بس ہے۔'' انداز جان چھڑانے والا تھا۔

''تم یہ جوس پیو، تمھارے بابا اور بھیا آنے والے ہیں۔ پھر ایک ساتھ کھانا کھالیں گے۔''

اور عاکفہ بیٹی کے جواب سے پہلو تہی کرتے ہوئے باورچی خانے سے باہر چلی گئی۔

صائمہ جوس کا گلاس پکڑے ماں کے پیچھے ہی چلی آئی۔ یہ سوچتے ہوئے کہ ماں سے کچھ تکرار کرے یا نہ کرے کہ بنگالی لوگوں سے اور بنگلہ دیش سے ان کو کیا تکلیف پہنچی ہے کہ وہ اتنی معمولی سی بات سے اس قدر رنجیدہ ہوگئی ہیں۔

''بابا، آجائیں تو ان سے پوچھوں گی۔'' اس نے خودکلامی کی ..... اور لاؤنج میں آکر ٹی وی چلا لیا۔

وہی شام کے مذاکرے اور ان میں شریک لوگوں کی بحثا بحثی، دعوے، الزام اور بے مقصد بے نتیجہ گفتگو، انسان بجائے ذہنی آسودگی کے زیادہ تھکاوٹ کا شکار ہوجاتا ہے۔

ٹی وی کی آواز بند کرکے وہ گھونٹ گھونٹ جوس پینے لگی۔ دھیان ماں اور بنگلہ دیش میں الجھا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر میں باپ بیٹا اپنے اپنے کاموں سے واپس آئے اور رات کا کھانا سب نے مل کر کھایا۔ ماں کی خاموشی۔ اداسی کا احساس دونوں کو بھی ہوگیا۔ عاصم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں بہن سے اشارتاً پوچھا کہ:

''کیا ہوا؟''

صائمہ نے ہونٹوں پہ انگلی رکھ کر اس کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

عاکفہ نے دونوں کی حرکت کو جان بوجھ کر نظر انداز کردیا۔ یہ بچے سمجھتے ہیں ماں سے کچھ بات چھپا سکتے ہیں۔ کوئی اور دن ہوتا تو وہ بچوں کو ضرور یہ کہہ ڈالتی۔ خاموش طبع، نفیس سے عارف چوہدری، اپنے دھیان کھانا کھانے میں مصروف تھے۔

اچانک ہی انھوں نے باقی تینوں کو دیکھا۔ خلاف معمول سب خاموش تھے۔

''کیوں بھئی! کیا آج دفتروں میں یا راستے میں لوگ نہیں تھے۔''

روزانہ بہن بھائی کی طرف سے لوگوں پہ تبصرے، باتیں سننے کو ملتی تھیں، آج خاموشی تھی۔

''بابا! آج مجھے لفٹ میں ایک آنٹی ملی تھیں۔'' صائمہ نے جھٹ سے اس خاموشی کو توڑا۔

''اچھا!''

''میں نے ان سے کہا کہ میں امی کو لے کر آپ کے پاس آؤں گی۔''

''بابا، وہ بنگلہ دیش کی ہیں۔'' صائمہ نے ٹشو پیپر سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے ساتھ ہی ماں کو دیکھا۔

عارف چوہدری نے چونک کر بیوی کو دیکھا۔

''خاموش چہرے پہ مزید گھمبیرتا چھا گئی تھی۔'' اور وہ اسی طرح اپنی خالی پلیٹ اٹھا کر باورچی خانہ میں چل دیں۔

عاصم اور عارف چوہدری نے محسوس کر لیا کہ آج گھر میں کوئی ایسی بات ہوئی ہے جس سے عاکفہ پہ مایوسی کا دورہ پڑنے والا ہے۔ اور کچھ وقت ان کو لگے گا نارمل ہونے میں۔ وہ وقت چند گھنٹے بھی ہو سکتے ہیں۔ چند دن بھی اور چند سال بھی۔ اگرچہ اب وقت کے ساتھ ساتھ یہ دورانیہ کم ہوتا جا رہا ہے لیکن اثرات تو باقی رہتے ہیں۔ تنہا ہو کر سوچ بچار کرتیں، خود ہی معمول پہ آ جاتیں۔ عارف چوہدری نے بچوں کو منع کر دیا کہ وہ اس وقت ان سے کوئی سوال نہ کریں اور دعا کریں کہ وہ اپنے معمول پہ جلد آ جائیں۔

''بابا! مجھے تو یاد نہیں کہ کبھی کسی اتنی تلخ بات کا تذکرہ ہوا ہو کہ امی اتنی.....!''

لاؤنج میں جھولتی کرسی پہ بیٹھے عارف چوہدری نے بیٹی کا جملہ اچک لیا۔ ''بیٹا، تم میٹرک کے بعد پاکستان چلی گئی۔ اس سے پہلے اگر کبھی کوئی بات ہوئی ہوگی تو تم نے دھیان نہ دیا ہوگا۔''

''مگر ایسی کیا بات ہے بابا!'' اس کے لہجے میں تشویش کے ساتھ ساتھ تجسس بھی تھا۔

عارف چوہدری کسی لمبی گفتگو کے موڈ میں نہ تھے۔ انھوں نے صائمہ کو مشورہ دیا ''تم پہلے انٹرنیٹ پہ دیکھو۔''

''کیا'' وہ حیران نظروں سے باپ کو دیکھنے لگی۔

''کہ تمھاری ماں کی اداسی کا تعلق بنگلہ دیش سے کیوں ہے؟''

''بابا!'' اس نے لفظوں کو ذرا کھینچتے ہوئے کہا۔ ''مذاق نہ کریں۔''

وہ سمجھی باپ اس بات کا اشارہ کر رہے ہیں کہ آج کا دور انٹرنیٹ سے مشورہ، حقائق جاننے کا دور ہے۔ بزرگوں، دانش وروں کا دور ختم ہو گیا ہے۔ یہ جملہ ہر زبان پہ رہتا ہے کہ نیٹ پہ دیکھیں گے، کیا ملتا ہے؟ اور اس بات پہ باپ اور بچوں میں گفتگو چلتی رہتی تھی۔

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ یہ تو تم جانتی ہو نا کہ پہلے بنگلہ دیش، مشرقی پاکستان ہوا کرتا تھا۔''

''جی'' صائمہ نے پورا دھیان لگاتے ہوئے باپ کو جواب دیا کہ اب بابا کچھ بتائیں گے۔

''صائمہ بیٹا! تمھارا کیا خیال ہے..... مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بننے کے متعلق۔ میرا مطلب ہے تعلیمی اداروں میں تمھیں کیا بتایا گیا ہے؟''

''مجھے یاد نہیں۔ کبھی کسی نے تذکرہ کیا ہو، بس یہ علم ہے کہ دو حصے تھے پاکستان کے، پھر وہ علیحدہ ہو گیا۔ بابا! اتنی دور دوسرا حصہ بنانے کی تک کیا بنتی ہے؟ پہلے ہی دو پاکستان بنا دیتے۔''

اسی وقت عاصم لاؤنج میں داخل ہوا۔ وہ صائمہ سے دو سال بڑا تھا۔ فارغ وقت نیٹ پہ بیٹھا اپنے دوستوں سے تحریری گفتگو کرتا رہتا..... بہن کی باتوں کو کسی خاطر میں نہ لانا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔

صائمہ بھائی کو دیکھ کر کچھ خجل سی ہو گئی کہ اب یہ

درمیان میں ایسی لن ترانیاں کرے گا کہ اصل بات کہیں سے کہیں جا نکلے گی۔

ساٹھ سالہ عارف چوہدری نے عاصم کو دیکھا تو بولے۔

''آج دونوں بہن بھائی نیٹ پہ یہ تحقیق کرو کہ مشرقی پاکستان، بنگلہ دیش کیوں بنا؟ صبح چھٹی ہے۔ آج میری طرف سے اجازت ہے ساری رات جاگ سکتے ہو۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔

''تم دو پاکستان بنا رہی تھی۔ میں نے آتے آتے سنا تھا۔ دوسرا کہاں تک پہنچا ہے؟''

''بھائی عاصم! خدا کے لیے مجھے ستاؤ نہیں۔ بابا ہمیں ہوم ورک دے گئے ہیں کل جمعہ کی نماز کے بعد پیش کرنا ہوگا..... میں واقعی یہ جاننا چاہتی ہوں کہ امی کی اداسی کا تعلق اس معاملے سے کیا ہے؟''

عاصم بھی سنجیدہ نظر آنے لگا۔''صومی! ہم بچوں کا المیہ یہ ہے کہ پاکستان سے دور رہ کر تاریخ پاکستان سے دور ہی ہو جاتے ہیں۔ نصاب اور پڑھانے والے استاد دونوں ہی حقائق سے روگردانی کرتے نظر آتے ہیں۔ میں نے اور تم نے اپنا سکول ٹائم ایسے اداروں میں گزارا جو کہ پاکستانی نہ تھے۔ ہم نے دوسروں کی تاریخ پڑھی .....مگر اپنی نہیں .....ہمیں دوسروں کے جغرافیہ پڑھنے پڑے مگر ہم اپنے وطن کے جغرافیہ سے بالکل واقف نہیں ہیں۔''

''ہاں، یہ تو ہے۔''

''اور کتنی بری بات ہے۔'' دونوں نے ایک دوسرے کو تائیدی نظروں سے دیکھا۔

''صومی! چلو دیکھیں نیٹ پہ کیا ملتا ہے؟''

دونوں اپنے اپنے لیپ ٹاپ پر تلاش کرنے لگے۔

''بھائی! یہ دیکھیں صدیق سالک کی کتاب کا لنک نکل آیا ہے۔''

''ہمہ یاراں دوزخ'' اور''میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا''

''ہاں! یہ میں نے کچھ ڈاکومنٹریز نکالی ہیں، اور یہ دیکھو ساتھ ہی کچھ انٹرویوز اور مذاکرے کے لنک بھی نظر آ رہے ہیں۔'' عاصم نے لیپ ٹاپ پہ نظروں جمائے بہن کو جواب دیا۔

''بھائی! اتنی موٹی موٹی کتابیں کون پڑھے گا۔ ہماری تو اردو بھی بہت کمزور ہے۔ شکر ہے گھر میں اردو بولی جاتی ہے تو اس سے ناطہ نہیں ٹوٹا۔''

''چلو، جتنا ہو سکتا ہے وہ تو کرتے ہیں۔''

''اچھا، میں''ہمہ یاراں دوزخ'' پڑھنے کی کوشش کرتی ہوں۔''

پھر صائمہ رات بھر کتاب کا مطالعہ کرتی رہی اور جذباتی ہو کر آنسو بہاتی رہی۔ اس نے دل میں اپنے وطن اور اس کی آبرو کے لیے ایک کسک اور درد محسوس کیا۔ وہی جو وہ اپنی ماں کے دکھ پہ دکھی ہو کر محسوس

کرتی تھی۔ وطن سے محبت بھی ماں کی محبت سے کتنی ملتی جلتی ہے۔ اسی لیے تو اس کو مادرِ وطن کہتے ہیں۔

ہندو حکومت کے ہاتھوں پاکستان اور اس کی فوج کی بے حرمتی پہ وہ زاروقطار روئی اور اسے اپنے دل میں بنگالیوں کے خلاف نفرت محسوس ہوئی۔ وہ غدار ہیں انھوں نے اپنے دشمن کو اپنے گھر میں گھسنے دیا۔ موقع دیا، اپنے وطن کی فوج کو شکست دلوائی۔

''واقعی امی ٹھیک کہتی ہیں۔'' بنگالی لوگ اچھے نہیں ہوتے۔

پاک فوج کے جوانوں کو جس طرح ہتھیار پھینکنے پڑے، اور جس طرح اس فوج کی دھاک ختم ہوئی .....ساری دنیا میں جس کی بہادری کا ڈنکا بجتا تھا۔

''اف! اف! میرے خدایا!'' اس نے روتے روتے اپنا سر کمپیوٹر ٹیبل پہ رکھ دیا۔ غم اور دکھ نے اس کو بے حال کر دیا۔

فجر کی نماز کے لیے عاکفہ اٹھیں تو صائمہ ابھی جاگ رہی تھی۔ دونوں نے اپنے اپنے کمرے میں نماز ادا کی..... اس کے بعد صائمہ لاؤنج میں آ کر آج کا اخبار باہر کے دروازے سے اٹھا کر دیکھنے لگی۔

بنگلہ دیشی کی حکومت نے برما سے ہجرت کرنے والے مسلمانوں کو اپنے علاقے میں داخل ہونے سے روکنے کا حکم دیا ہے اور بہت سے مسلمان بنگلہ دیش میں داخل ہوتے ہوئے گولیوں کا نشانہ بن گئے۔

صائمہ کے دل میں غصہ اور غم کی لہر اٹھی۔ یہ سب ان ہندوؤں کے ساتھ رشتے بنانے کا نتیجہ ہے۔

اسی وقت عاکفہ لاؤنج میں داخل ہوئیں اور صائمہ جھٹ ماں کے سینے سے لگ گئی۔

''امی! آپ ٹھیک کہتی ہیں۔''

''کیا؟''

''کہ بنگالی لوگ ٹھیک نہیں ہوتے۔ انھوں نے پاکستان کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ ہمیں تو علم ہی نہ تھا کہ کیا ہو چکا ہے۔''

''صائمہ! جس دن بنگلہ دیش بنا، وہ ہماری قوم، بلکہ پوری امت مسلمہ کے لیے ایک سیاہ دن تھا..... ایک ایسی اسلامی ریاست کے دو ٹکڑے ہو گئے جو دنیا میں سب سے بڑی اسلامی مملکت تھی۔ مدینہ ثانی اور اسلام کا قلعہ کہلاتی تھی۔''

عاکفہ صوفے پہ بیٹھ گئیں تو صائمہ ماں کے قدموں میں بیٹھ گئی اور سر ماں کی گود میں رکھ لیا۔ جیسے روٹھی ماں کو منا رہی ہو.....

عاکفہ نے بیٹی کا سر ہلاتے ہوئے دلگیر لہجے میں بتایا۔

''صائمہ! میں اس وقت مڈل کلاس کی طالبہ تھی۔ جس دن یہ سانحہ ہوا۔ میرے ابا جان اتنا روئے اور اتنی بری طرح دھاڑیں مار مار کر روئے کہ دیواروں سے ٹکریں ماریں اور وہ اسی رات یہ جہاں چھوڑ گئے۔ پتہ نہیں رات کے کس پہر ان کا ''نروس

بریک ڈاؤن'' ہو گیا تھا۔'' عاکفہ کی آواز گلے میں ہی دب گئی ..... اور دونوں چپ چاپ آنسو بہاتی رہیں۔

''میرے کانوں میں اپنے ابا جان کی آخری آواز بلکتے بچوں کی طرح کی آواز ہی سنائی دیتی ہے ..... یہ آخری آواز تھی جو ہم نے اپنے باپ کی سنی۔'' عاکفہ نے ایک لمبا سانس لینے کے بعد اپنے دل کا دکھ بیٹی کو منتقل کیا۔ کچھ دیر دونوں خاموش رہیں۔

''تم رات بھر نہیں سوئی نا!'' عاکفہ نے بیٹی سے پوچھا۔

''جی امی! وہ میں کتاب پڑھ رہی تھی۔''

''اچھا اب سو جاؤ۔''

صائمہ خود بھی یہی چاہ رہی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں چلی گئی اور عاکفہ تلاوت کے لیے سٹڈی میں چلی گئیں۔

جمعہ کی نماز اور کھانے کے بعد گھر کے سب افراد ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے تو عارف چوہدری نے دونوں بچوں کو باری باری دیکھا۔ بغیر کچھ کہے دونوں سمجھ گئے کہ رپورٹ طلب کی جا رہی ہے رات کو دیے گئے کام کی .....۔

''بابا! پاکستانی فوج کی جو رسوائی ان بنگالیوں نے کروائی ہے نا! میں ان کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔'' جوش جس میں غصہ نمایاں تھا وہ صائمہ کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا۔

عاصم نے اس کا جوش و جذبہ انتقامی سا دیکھا تو بولا۔

''تم نے یہ نہیں سوچا کہ بنگالیوں نے یہ سب کیوں کیا؟''

عارف چوہدری نے ہاتھ اٹھا کر عاصم کو خاموش کرایا۔

''آپس میں بحث نہیں ..... آرام سے دلائل کے ساتھ بات کرو۔''

''جی بابا'' عاصم نے ادب سے باپ کو جواب دیا۔

''صائمہ بیٹا آپ نے کیا پڑھا؟''

''بابا! میں نے صدیق سالک کی ''ہمہ یاراں دوزخ'' پڑھی۔ میں کچھ باتیں اور بھارتی حکومت کے ہاتھوں پاکستانی فوج کی رسوائی کے واقعات پڑھ کر بہت روئی۔''

''تم رونے دھونے کے علاوہ کر بھی کیا سکتی ہو۔'' عاصم عادت سے مجبور تھا۔ بہن کی طرف ایک تیر پھینک ہی دیا۔

''عاصم!'' ماں نے سرزنش کی۔

''جی امی!'' عاصم نے معذرت خواہانہ لہجے میں جواب دیا۔

''بابا! میں نے جو کچھ رات بھر میں تلاش کیا۔ وہ سب سامنے رکھ کر جو نقشہ یا حالات سمجھ سکا ہوں۔ وہ یہ ہیں کہ..... بنگال کے لوگ محبِّ وطن ہیں۔ پاکستان

بننے سے بہت پہلے آزادی کی تحریک ان کے اندر موجود تھی۔ انگریزوں کا اصل مدمقابل بنگال تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا مقابلہ اور اس کی مزاحمت بنگال نے کی..... ٹیپو سلطان کو شکست کچھ گھر کے بھیدی کی غداری کی وجہ سے ہوئی۔''

''تو غدار تو ہیں نا'' صائمہ نے بیچ میں ٹوکا۔

''وہ ہر قوم میں ہوتے ہیں۔ کوئی قوم غداروں سے خالی نہیں ہوتی، چند لوگوں کی وجہ سے پوری قوم کو لعنت ملامت نہیں کی جاسکتی۔''

عارف چوہدری نے صائمہ کو اشارے سے چپ کرایا۔

عاصم نے اپنی بات شروع کی۔

''۱۷۵۷ء میں جب بنگال سے مزاحمت ٹوٹی تو ایسٹ انڈیا کمپنی کا ہندوستان پہ قبضے کا خواب پورا ہوا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا باعث بھی بنگال کی حریت پسندی تھی۔

جب ہندوستان تقسیم کرنے اور ہندو مسلم الگ ریاستوں کا مطالبہ شروع ہوا تو انگریز نے ۱۹۰۵ء میں بنگالی قوم پرستی کو ہوا دی اور اس صوبے کو دو حصے میں تقسیم کر دیا۔

اچھا اب میں مسلم ریاست کے مطالبے کے بارے میں آپ کو بتاتا ہوں۔ یعنی ''پاکستان'' بنانے میں بنگالیوں کا کتنا ہاتھ ہے۔

مسلم لیگ کی بنیاد ڈھاکہ میں رکھی گئی۔ تقسیم ہند کی قرارداد بنگال نے پیش کی۔ قراردادِ لاہور بنگالی لیڈر فضل الحق نے پیش کی۔

جب تقسیم کے وقت بنگال کو پیش کش کی گئی کہ دو اٹانومس ریاستیں بنائی جائیں تو بنگالیوں نے خود مطالبہ کیا کہ ہم دو نہیں ایک ملک بننا چاہتے ہیں۔ دستور ساز اسمبلی میں لیاقت علی، شبیر احمد عثمانی کو پہنچانے کا سہرا بنگالیوں کے سر ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اگر بنگال کی جدوجہد نہ ہوتی تو پاکستان کا معرض وجود میں آنا مشکل تھا۔''

عاصم نے تینوں کو باری باری دیکھا اور منجھے ہوئے مقرر کی طرح گویا ہوا۔

''۱۷۵۷ء سے حریت کی تحریک چلانے والے بنگال کو محنت، جدوجہد اور قربانیوں کا صلہ ۱۹۴۷ء میں ملنا تھا۔

مگر کیا ہوا؟ پاکستان کی ابتدائی کابینہ میں خاطر خواہ کردار نہ دیا گیا اور پھر زبان کا مسئلہ.....

اگر قائداعظم دونوں حصوں میں اردو قومی زبان کا اعلان نہ کرتے تو اچھا تھا۔ انھوں نے ایک ایسے خطے میں وہ زبان رائج کرنی چاہی جو وہاں بہت کم بولی جاتی تھی اور ان کا تلفظ لب ولہجہ اس کے لیے مناسب نہ تھا۔''

''بھائی! آپ قائداعظم کو نہ کچھ کہیں۔ انھوں نے ٹھیک ہی کیا ہوگا۔''

''کیوں؟ کیوں کیا وہ انسان نہیں تھے۔ ان

سے غلطی نہیں ہوسکتی تھی۔''

''لو اب یہاں پورے عرب میں بنگالی اردو بولتے ہیں یا نہیں؟ تب بھی سیکھ جاتے اب تو بغیر سیکھے بولنی ہی پڑتی ہے۔'' صائمہ کا غصہ ابھی بھی برقرار تھا۔

''۱۹۴۹ء میں دستور ساز اسمبلی، قراردادِ مقاصد میں بنگالیوں کو کچھ تحفظات تھے کیونکہ مغربی حصے کے لوگ مشرقی حصے پہ حکمرانی کرنا چاہتے تھے۔

اصل میں اس وقت پاکستان کے کرتا دھرتا لوگ انگریزوں کے قانون اور اسی کی سوچ رکھتے تھے۔ انگریز بنگالیوں سے خار کھاتے تھے۔ کیونکہ ان کی مزاحمت ان کو بہت دیر تک برداشت کرنا پڑی۔ جب ہندوستان پہ انگریزوں کا غلبہ ہو گیا تو انتقامی رویہ بنگالیوں کے ساتھ رہا۔ محکوم، بے بس بنا کر رکھا گیا۔

اب پاکستان کے حکمران بھی اسی سوچ کے تحت بنگالیوں کے ساتھ سلوک کر رہے تھے۔ مشرقی حصے کے لیے ترقیاتی فنڈ ہوں یا منصوبے، مغربی حصے کے مقابلے میں بہت کم رکھے گئے ..... حالانکہ ان کی آبادی مغربی حصے سے زیادہ تھی۔

فوج میں بنگالیوں کا حصہ نہ ہونے کے برابر تھا کہ ان کے قد اور جسمانی ساخت فوجی پیمانے پہ پوری نہیں اترتی۔

ان کے وسائل ان پر ہی استعمال نہ کیے گئے۔ بیوروکریسی، سیاست دان، حکمران اور فوج نے ان کو اپنے جسم و جان کا حصہ نہ سمجھا بلکہ ان کو محکوم سمجھ کر محروم رکھا گیا۔ ۱۷۵۷ء سے بنگال جس آزادی کے خواب دیکھ رہا تھا وہ ٹوٹ رہا تھا۔ اس کی تعبیر الٹ نظر آ رہی تھی۔ انگریزوں نے مراعات بنگالیوں کو نہ دی تھیں کہ وہ آزادی کے طلبگار تھے مراعات کے نہیں۔ مغربی حصے کے حکمرانوں میں اور سیاست دانوں میں مراعات یافتہ طبقہ موجود تھا..... جیسا رزق ہوگا ویسی ادائیں ہوں گی۔''

عارف چوہدری نے مسکرا کر بیٹے کو داد دی۔ صائمہ بار بار پہلو بدل رہی تھی ..... عاکفہ خاموشی سے بیٹے کو بولتے دیکھ رہی تھی۔

باپ کی طرف سے حوصلہ افزائی پر عاصم اور پر جوش ہو گیا۔

''جب صدر ایوب نے الیکشن کروائے تو فاطمہ جناح مدمقابل تھیں۔ وہ مغربی حصے سے ناکام رہیں مگر مشرقی حصے نے قائداعظم کی بہن کا لحاظ کیا اور لاج رکھی۔ بنگالی خون میں حق خودارادیت اور حریت پسندی ختم نہیں کیا جا سکتا تھا مگر ان کے خواب ٹوٹ رہے تھے۔ انھوں نے چھ نکاتی ایجنڈا پیش کیا۔ جن میں سے ساڑھے پانچ ان کے حق میں ہی تھے۔

بابا! آپ کو معلوم ہے ۱۹۶۹ء میں صدر ایوب نے اپنی کابینہ میں کہا کہ مغربی پاکستان کے مسائل حل کرنا اہم ہیں، یہ چلتا رہے گا۔ مشرقی پاکستان تو چند سال رہے گا..... بابا! وہ تو چند کیا دو سال بھی نہ رہا۔''

عاصم نے اپنے لہجہ میں نمی محسوس کی۔

''جب ایک ملک کا صدر اپنی کابینہ میں یہ کہہ رہا ہوتو پھر باقی کیا رہ جاتا ہے؟''

مشرقی پاکستان کے باسی برملا یہ کہتے تھے کہ ''ملک ہم نے بنایا، تم نے قبضہ کرلیا۔ جب بڑا بھائی چھوٹے کو اس کا حق نہ دے تو پھر ایسے ہی ہوتا ہے۔''

''چھوٹے بھائی کو بھی تو بڑے بھائی کا لحاظ کرنا چاہیے۔'' صائمہ چپ نہ رہ سکی۔

''بڑے بھائی سرپرست ہوتے ہیں اور سرپرستی کرنے والا ایثار زیادہ کرتا ہے۔ خیال رکھنا اسی کا فرض ہوتا ہے۔'' عاصم نے صائمہ کی طرف منہ کرکے لفظ چبا چبا کر کہا۔

''اچھا! عصر کی نماز کا وقت قریب ہے، بات مکمل کرلو جلدی سے۔'' عارف چوہدری نے دیوار گیر گھڑی کی طرف اشارہ کیا۔

''مشرقی پاکستان کے معاملات میں سرد مہری فوج اور حکومت میں مناسب نمائندگی نہ دینا، حقارت سے دیکھنا، قدرتی آفات پہ سنگ دلی دکھانا..... بجٹ اور ترقیاتی منصوبوں میں حصہ حق کے مطابق نہ رکھنا، کسی بھی ملک کے باشندوں کو محرومی کا احساس دلاتا ہے۔

اور پھر دشمن اپنی چال چلتا ہے۔ محرومی دور کرنے آجاتا ہے اور اس آڑ میں وہ گھر پہ گھس بیٹھتا ہے۔ شاطر و مکار ہندو نے اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ بھارت نے اپنی سرحدیں ان محروم لوگوں کے لیے کھول دیں۔ اور اپنے آزمودہ ہتھکنڈوں سے ان لوگوں کو پاکستان دشمنی کی تربیت دی۔ لاکھوں لوگ تیار کیے گئے اور لاکھوں مکتی باہنی کی شکل میں مشرقی پاکستان میں لائے گئے۔ پھر تعلیمی اداروں میں ان کا عمل دخل، ثقافت، ذہنی ابتری، نفرت کا احساس، اسلام پسندوں کے خلاف جارحیت کا جذبہ..... یہ سارے عوامل بھارت کو اس سرزمین پر پنجے گاڑنے کے لیے کافی تھے۔'' عاصم نے پہلو بدلا۔

پانی کا گلاس اٹھا کر دو گھونٹ پیے۔ گلا تر ہوا تو اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

''مشرقی پاکستان میں گورنر مغربی پاکستان سے آتے تھے۔ ایک مغربی پاکستانی کے پاس مشرقی پاکستان میں تین تین عہدے ہوتے تھے۔

بابا! ہم بنگالیوں کو کیا باور کرانا چاہتے تھے کہ وہ نالائق ہیں، وہ ملک چلانا نہیں جانتے؟ مغربی پاکستان میں کسی بنگالی کو ایس ایچ او بھی نہیں لگایا جاتا تھا مگر مشرقی پاکستان میں سارے عہدے مغربی پاکستان کے لوگوں کے پاس تھے۔ اسی لیے.....'' عاصم نے پانی کا گلاس میز پہ رکھ دیا۔

''جب مشرقی پاکستان میں فوج کو مکتی باہنی اور بھارتی فوج سے لڑنا پڑا تو ان کی پشت پہ عوام نہ تھی۔ نہ وہاں کے فوجی جوان تھے۔ جنگیں عوام کی پشت پناہی اور ماؤں کی دعاؤں کے بغیر نہیں جیتی جاسکتیں .....اور نہ مقامی جوانوں کے بغیر..... پھر ہمیشہ یہ کہا

جاتا رہا کہ ''ہم مشرقی بازو کا دفاع مغربی بازو سے کریں گے۔'' جب بھارت مشرقی پاکستان میں گھس آیا تو مغربی محاذ خاموش رہا۔ اگر ادھر سے بھارت کو ناکوں چنے چبوائے جاتے تو اس کے ہوش ٹھکانے آ جاتے۔''

بھارت کے نام پہ صائمہ کو بھی جوش آ گیا۔

''ہاں اور کیا ..... جبکہ دونوں حصے اس کمینے بھارت کو پیس کر رکھ دیتے درمیان میں۔''

عاصم نے مسکرا کر بہن کو دیکھا اور بولا۔

''مشرقی پاکستان کے خلاف بھارت نے تین محاذ کھولے۔

مسلح افواج، وزارت خارجہ، مکتی باہنی ..... اور خود بڑے بھائی نے کیا کیا؟'' عاصم کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

''اپنے ہی چھوٹے بھائی کو قتل کر دیا۔ دشمن کے حوالے کر دیا۔ اس وقت وہ جوان تھا بلکہ آتش جواں ہی نہ تھا، جواں تر تھا۔

جب امنگیں ٹوٹ جاتی ہیں تو جواں لمحوں میں ہی بڑھاپا آ جاتا ہے۔''

کمرے میں صرف عاصم کی آواز تھی باقی سب خاموش تھے۔ کمرے کی ہر چیز سانس روکے ان حقائق کو سن رہی تھی۔

اسی اثنا میں عصر کی اذان ہونے لگی۔ اس کے احترام میں عاصم بھی خاموش ہو گیا۔ اذان کی آواز خاموشی میں فلاح کی پکار تھی۔ اندھیروں سے اجالے میں آنے کی دعوت تھی۔ دلوں میں اٹھتے جذبات اور ذہنوں میں کشمکش تھی۔ وہی کشمکش جو تسلیم کر لینے سے پہلے ہوتی ہے۔

عاکفہ نے اذان ختم ہونے پہ پہلی بار اپنی رائے دی۔

''شکر ہے مشرقی پاکستان بھارت کا اٹوٹ انگ نہیں بنا۔ ایک اسلامی مملکت کا اضافہ ہی ہوا۔''

عارف چوہدری نے بیوی کی مثبت رائے پہ خوشی کا اظہار کیا اور دونوں بچوں کو تھپکی دی۔ مرد نماز کے لیے جا چکے تھے اور عاکفہ بھی جاءنماز پہ بیٹھی عجیب تذبذب کا شکار تھی۔ تصویر کا دوسرا رخ ایک کسک بن کر رہ گیا تھا۔

''یا اللہ! میں نے اپنے ان بہن بھائیوں کو بہت برا بھلا کہا ..... یہاں کتنی بنگالی عورتیں گھر گھر محنت مزدوری کرتی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی عمروں میں بیاہی جاتی ہیں اور پھر کمائی کر کے اپنے سسرال بلکہ میکے والوں کی بھی معاونت کرتی ہیں۔ میں نے ہمیشہ یہ سمجھا کہ ان کو دنیا میں سزا مل رہی ہے کہ بس دوسروں کی غلامی کریں۔ پاکستان کی کوئی عورت گھریلو ملازمہ کے ویزے پہ ملک سے باہر نہیں جا سکتی۔ اگر یہ بھی پاکستانی ہی رہتیں تو ان کو اس طرح دربدر نہ پھرنا پڑتا.....''

مگر آج عاکفہ کو محسوس ہو رہا تھا کہ اگر ان کے

یہ حالات ہیں تو اس میں قصور ہم ''بڑے بھائی'' کے گھر والوں کا بھی ہے۔ الگ ملک بنا کر بھی جانے ان کے چہرے پہ بشاشت اور خوشحالی کی رونق کیوں نظر نہیں آتی؟ مرد ہوں یا عورت سب بے رونق اور پژمردہ کیوں رہتے ہیں۔ شاید ہمارا قصور ہو..... ان کو یہ احساس محرومی ہم نے دیا ہے۔

یا اللہ! انفرادی اور اجتماعی قصوروں کی ہم معافی طلب کرتے ہیں۔ یا اللہ ہمیں سیدھی راہ اور صاف شاہراہ مستقیم کی طرف گامزن کردے۔ آمین

نماز کے بعد سب نے شام کی چائے پر بھی اسی موضوع پر اپنا اپنا احساس دوسروں تک منتقل کیا۔

عاکفہ جلدی معمول پر آ گئیں۔ ایک دن صائمہ اپنی ماں کو لے کر حجاز پارک میں لمبی سیر کے لیے نکلی۔ دسمبر کے سہانے دن تھے۔ صبح سویرے روشوں میں رنگ برنگے پھولوں کی بہار تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے بہت خوشگوار موڈ میں تھے۔ لمبی سیر کرنے اور تیز تیز چلنے والوں کے لیے سرخ رنگ کا راستہ بہت بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے سرخ قالین قدموں کے نیچے بچھا دیا گیا ہو۔

چلے چلتے صائمہ نے سامنے سے آتی انہی بنگالی آنٹی کو دیکھا..... قریب آ کر اس نے سلام کیا اور اپنی امی کا تعارف کرایا..... آج اس کو فکر نہ تھی کہ اس کی ماں بنگالی خاتون سے ملنے سے بدک جائیں گی۔

''آپ آئیں ہمارے گھر.....'' عاکفہ نے پہل کی۔

''آپ کی بیٹی وعدہ کر گئی تھی آپ کو لائے گی .....آپ پہلے آیئے۔''

''جی ضرور ان شاءاللہ۔''

اور پھر دوسرے دن صائمہ اپنی ماں کو لے کر تیسری منزل کے تین سو تین فلیٹ کی گھنٹی بجا رہی تھی .....ان کو نہیں معلوم تھا کہ اس کہانی کا اگلا حصہ اس گھر میں سننے کو ملے گا۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا۔ خوش دلی سے سلام دعا ہوا اور اندر داخل ہوتے ہی دونوں بری طرح ٹھٹک گئیں۔ پاؤں زمین پہ جم گئے۔ نظریں دیوار پہ لگی تصویروں پہ ٹک گئیں..... ماں بیٹی نے ایک دوسرے کو تعجب بھری نگاہوں سے دیکھا۔ مگر کچھ بولی نہیں۔ اگرچہ سوال زبان پہ مچل رہا تھا۔

''آپ آرام سے بیٹھئے۔'' آنٹی نے دونوں سے کہا۔

سادہ سے لاؤنج میں بس وہ تصویریں ہی نمایاں لگ رہی تھیں۔

پتہ نہیں کیا بات کی جائے اور کہاں سے شروع کی جائے؟

بس صائمہ کو یہی سوجھا کہ پوچھ لے کہ آپ کی دن بھر کی کیا مصروفیات ہوتی ہیں؟

''کچھ خاص نہیں۔ تین بیٹیاں ہیں۔ دو کی شادی کر دی ہے۔ وہ پاکستان میں ہوتی ہیں۔ تیسری

ابھی پڑھائی سے فارغ ہوکر آسٹریلیا سے آئی ہے۔ اس کی بھی شادی ہو جائے اللہ کرے کسی پاکستانی سے۔''

''آنٹی! پاکستانی سے ہی کیوں؟''

''اس لیے کہ ہم پاکستانی ہیں.....'' صائمہ خاموش ہوگئی کہ اب کیا پوچھے؟

عاکفہ نے پوچھا ''بہن آپ کا نام کیا ہے؟''

''میرا نام فاطمہ ہے۔ بیٹیوں کے نام عائشہ، اسماءاورعمارہ ہیں۔''

''اچھا'' عاکفہ نے مختصر سا جواب دیا۔''بہت اچھے نام ہیں یقیناً خود بھی اچھی ہوں گی۔''

صائمہ نے ہمت کرکے پوچھ ہی لیا۔

''آنٹی یہ تصویریں.....''

فاطمہ نے سر گھما کر دیوار پہ لگی تصویروں کو دیکھا۔''بھئی یہ ''مفکر پاکستان'' ہیں اور یہ ''بانی پاکستان'' ہیں ..... پاکستانی کے گھر میں تو یہی تصویریں ہونی چاہئیں ناں!''

''آنٹی ہم کئی دن سے اسی موضوع پہ بات کر رہے ہیں کہ پاکستان کے دوسرے حصے کے ساتھ کیا ہوا؟.....آپ بھی تو مشرقی پاکستان میں رہتی ہوں گی نا!''

''ہاں! ہم مشرقی پاکستان میں رہتے تھے..... پاکستان بنانے میں ہمارے باپ دادا کی محنت وکاوش بھلائی نہیں جاسکتی۔ وفاداری اور ایمان داری ان کا شعار تھا۔''

سچے پاکستانی۔محبت وطن۔وہ اگرچہ بنگالی لہجے میں بات کررہی تھیں کبھی انگلش میں بولنے لگتیں، لگتا ہے وہ بھی بہت کچھ کہنے کو بے تاب ہیں کسی سے اپنے دل کا حال سنانے کو من مچل رہا ہے۔

''۷۰ء میں محبّ وطن پاکستانیوں پہ برا وقت شروع ہوگیا تھا۔ ہندوؤں کی آمدورفت جاری تھی۔ محبّ وطن پاکستانیوں کی لسٹیں تیار ہورہی تھیں۔تعلیمی اداروں پہ ان کے قبضے ہوتے جارہے تھے۔میرے دادا نے بیٹوں کو بلا کر عہد لیا کہ تم نے پاکستانی بن کر جینا ہےاور پاکستانی ہی مرنا ہے۔

انہی دنوں محبّ وطن پاکستانیوں کی سربریدہ لاشیں سڑکوں پہ پائی جانے لگی تھیں ..... انھوں نے تب اندازہ لگالیا تھا کہ حالات کا رخ بہت بری راہ پہ گامزن ہونے کو ہے۔ ابھی تم لوگ ملک چھوڑ دو، حالات اچھے ہوں گے تو واپس آجانا'' شستہ انگریزی میں بات کرتی ہوئی فاطمہ کا گلا رندھ گیا۔

مگر حالات پھر کبھی اچھے نہ ہوئے ..... ساری کے پلو سے انھوں نے آنکھوں کا پانی خشک کیا۔

ایک ٹھنڈی آہ بھر کر فاطمہ نے پہلو بدلا .....

''ہم چودہ سال کے تھے ہمارا نکاح چچازاد نصیرالدین سے کرکے آسٹریلیا بھجوادیا گیا۔سب گھر والے وہاں ہی رہ کر شہید ہو گئے سوائے ہمارے۔ہم نے آسٹریلیا کا پاسپورٹ حاصل کرلیا۔ بنگلہ دیش بنا ہم نہ

گئے نہ ہم نے بنگلہ دیشی پاسپورٹ لیا کیونکہ یہ ایک عہد تھا کہ ٹوٹے ہوئے پاکستان کو قبول نہیں کرنا تھا۔''

اسی وقت ایک کامنی سی لڑکی چائے کے لوازمات لے کر کمرے میں داخل ہوئی۔

''یہ میری عمارہ ہے۔'' اس نے دونوں کو سلام کیا۔ صائمہ نے ہاتھ ملایا اور چائے بسکٹ سے ان کی تواضع کرنے لگی۔

''اچھا آنٹی پھر کیا ہوا؟'' صائمہ نے گفتگو کا سلسلہ پھر سے جوڑا۔

''ہونا کیا تھا ..... پاکستان سے محبت کے جرم میں ہمارا سارا خاندان زندہ جلایا گیا۔ پہلے سب کو حفاظتی جگہ پہنچانے کا جھانسہ دے کر ایک مکان میں رکھا اور سب ایک ساتھ شہید کر دیے گئے۔ ایک ہجرت ہندوستان سے کی تھی ..... اور اب یہ ہجرت دار آخرت کی طرف ہوگئی۔

اس وقت ہم دونوں کے علاوہ خاندان کا کوئی فرد نہیں جو ہمارا رشتہ دار کہلائے۔ پاکستانی ہونے کی اور وطن سے محبت کی قیمت ہم نے چکائی ہے۔ ہم نے۔ اور ہم جیسے ہزاروں خاندانوں نے ..... جواب نہ پاکستانی ہیں نہ بنگلہ دیشی۔''

فاطمہ نے سینے پہ ہاتھ مارا۔'' اصل میں ہم پاکستانی ہیں۔ پاکستان ہمارا ہے۔ ہم نے اپنا وہ پاکستانی پاسپورٹ تبرک کے طور پر سنبھال رکھا ہے۔ ہم دونوں میاں بیوی نے دونوں بڑی بیٹیوں کو ایک پاکستانی سے بیاہ دیا۔ وہیں آسٹریلیا میں اب وہ لاہور میں آباد ہیں تاکہ ہماری نسلیں پاکستانی کہلائیں۔ وہ وعدہ جو ہم نے اپنے باپ دادا سے کیا تھا کہ مرتے دم تک پاکستانی رہیں گے۔ اور ہم وہاں نہیں گئے کہ وہ چمن ہم کو آدھا گوارا نہ تھا ..... مدینہ ثانی کو چھوڑ کر بھلا وہاں کیسے بس جاتے؟''

ان کی باتوں سے سچائی کی مہک نے کمرہ میں ایک ناقابل فہم سی خوشگوار فضا بنا دی تھی۔ اگرچہ صائمہ اور اس کی ماں کے دل سخت شرمندہ تھے۔ وطن سے سچی محبت کا مفہوم اس طرح انھوں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

''آنٹی! وہ بھی تو ایک اسلامی ملک ہی بن گیا ہے۔ ہم تو اس بات پہ مطمئن ہوگئے ہیں۔''

''ہاں ایک لحاظ سے بات درست ہے، مگر وفا کا وعدہ پورا کرنا ہی محبت کی شان ہے..... اور پھر وفا کے تقاضے ہر کسی کی سمجھ کے مطابق ہوتے ہیں۔ ہماری سمجھ یہ کہتی ہے کہ محبت میں وفا، پائیداری اور استقامت اصل ایمان ہے۔'' فاطمہ نے محبت کا نیا فلسفہ وطن کے حوالے سے بیان کر دیا۔

عمارہ نے سب کو چائے وغیرہ پیش کی پھر صائمہ کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔ اور پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا۔

''ہم لوگ پاکستان کے حالات پہ بہت پریشان رہتے ہیں۔ بلوچستان کا معاملہ اگر غور کریں تو کسی قدر ملتا جلتا ہے مشرقی پاکستان کے حالات سے۔''

☆☆☆

''ہم نے کوئی سبق نہ سیکھا.....'' صائمہ نے دکھ سے کہا۔''سب اپنے اپنے مفاد کے پیچھے قومی مفاد کو بھول بیٹھے ہیں۔''

''جو قوم سے غداری کرتا ہے اس کا انجام تو اچھا نہیں ہوتا نا! مشرقی پاکستان کو الگ کرنے کے سارے قصور وار عبرت کی موت مرے بلکہ ان کی اولادیں بھی.....'' عمارہ نے پتے کی بات کہی۔

دونوں خواتین ایک دوسرے سے باتوں میں مصروف ہوگئیں۔لڑکیاں اپنی باتوں میں لگ گئیں۔

''ارے ہاں! میں تو کبھی اس طرح سوچا ہی نہیں۔'' صائمہ نے جواب دیا۔ حالانکہ وہ دل میں شرمندہ ہورہی تھی کہ انھوں نے کسی بھی موضوع پہ کبھی نہ سوچا نہ پڑھا تھا نہ وطن کی محبت کو اپنے ایمان کا حصہ بنایا تھا۔

اس نے رشک سے عمارہ کو دیکھا جو پاکستانی ہونے اور اسی شناخت پہ قائم رہنے پہ مصر ہے۔

ادھر ادھر کی مزید باتیں ہونے لگیں اور پھر وہ رخصت لے کر اپنے ہاں آنے کی دعوت دے کر چلی آئیں۔ لفٹ میں کھڑی صائمہ نے اپنی ماں کو کچھ سوچتے ہوئے دیکھا.....

''امی! کیا سوچ رہی ہیں؟''

''عمارہ بہت اچھی بچی ہے۔'' اور ماں کی معنی خیز مسکراہٹ سے وہ خوب جان گئی کہ اب گھر جا کر مجھے عاصم بھائی کو خوب تنگ کرنا ہے۔

مونالیزا

گہرے سیاہ بالوں کے درمیان سیدھی شفاف مانگ اورمیک اپ سے بے نیاز اس کا بیضوی چہرہ مونالیزا سے کوئی مشابہت رکھتا ہو یانہیں لیکن احمر کو اسے دیکھ کر ہمیشہ ہی مونالیزا کا خیال آتا تھا اوروہ اس خیال آنے پر اکثر ہی دل میں مسکرا دیتا۔کہاں لیونارڈو کا شاہکار اورکہاں تیسری دنیا کے ایک ملک کا شاید تیسرے ہی درجہ کا یہ وجود۔احمرتم تو زمین آسمان ایک کیے دے رہے ہو!عقل کی تاویلیں سن کر بھی اسے وہ یعنی سارہ اورمونالیزا جڑی نظر آئیں۔

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے!

وہ اکثر اس سپر مارکیٹ میں آتا تھا جہاں سارا کاسمیٹک ایریا کے ساتھ جڑے بچوں کے سیکشن میں موجود ہوتی تھی۔کبھی شیمپو،کبھی کلون تو کبھی مردانہ کاسمیٹک شیلف سے اٹھاتے احمر کی نگاہ اردگرد موجود بنے سنورے چہروں پر گھومتی ہوئی ضرور سارا پر ٹکتی، جس کا نام اسے سال بھر بعد پتہ چلا تھا ورنہ وہ اس سیکشن میں کام کرنے والے اسٹاف کے ناموں سے بخوبی واقف تھا۔

نکھری نکھاری متناسب قدوقامت کی لڑکیاں جن کو کاسمیٹک کمپنیاں اپنی مصنوعات کے اشتہار کے طور پر بڑے بڑے اسٹورز میں موجود رکھتی ہیں،کاروبار بڑھانے میں معاونت کرتی ہیں۔بڑے انداز سے پلکیں اٹھاتی جھکاتی،میک اپ آرٹ سے بنی سنوری یہ دوشیزائیں حسن پرست اورہوس پرست دونوں ہی کے کسی نہ کسی درجہ کے حلقہ میں شامل ہوجاتی ہیں،اس لیے وہ بلا کا حسن پرست احمر جسے حدنگاہ تک ماند پڑتی خوبصورتی برداشت نہ ہوتی تھی یہاں آکر خاصا شانت رہتا تھا۔وہ خودتو عمومی انسان ہی لگتا لیکن وضع قطع کی آرائش نے اسے خصوصی تاثر دے رکھا تھا۔ جس کا اسے بہ خوبی احساس تھا۔اسکی نگاہوں کا ارتکاز محسوس کرکے کتنی ہی لڑکیاں مسکرا دیا کرتی تھیں کیونکہ اس کی شخصیت کے کسی درجہ کے کروفر کی بنا پر لوگوں کو اس پر نادیدہ پرائس ٹیگ لگا نظر آنا تھا،گاڑی کے کی چین سے لے کر عمدہ چمڑے کے جوتوں تک،ہر ایک پر لگا مخفی ٹیگ کتنوں کو متاثر کردیا کرتا تھا۔ایسے مہنگے لوگوں کا ہلکا تبسم بھی انکو خوش اخلاق ہونے کا ایوارڈ دلانے کو کافی ہوتا ہے۔سوحضرات میں وہ جگر کہلاتا تھا تو حسیناؤں میں دلبر مگر تمیں کا ہونے کے باوجود اسے اپنے لیے کوئی دلربا نہیں ملی تھی۔دوائیوں کی کمپنی میں عمدہ جاب نے اسکی کشش میں خاصا اضافہ کردیا تھا۔

گھر والے اس سے شادی کا اصرار گاہے بہ گاہے کرتے ہی رہتے تھے۔ بقول اس کی بہن بینش کے:

''احمر بھائی یقیناً کسی خلائی مخلوق کا انتظار کر رہے ہیں ورنہ کتنی اپسرائیں تو انہوں نے کھٹ سے مسترد کر دی ہیں۔ وہ بھی اتنے فضول اعتراضات کے ساتھ کہ ان کی عقل پر شبہ ہوتا ہے۔''

امی لاکھ بیٹی کی طرفداری کریں لیکن بیٹے کی عقل پر شبہ کرنا ان کو پسند نہ آیا اور وہ خفگی سے بیٹی کو دیکھتیں۔ ''زندگی اس نے گزارنی ہے جو پسند آئے گی اس کے ساتھ تو شادی کرے گا یا تمہارے اور نازش کے کہنے پر کسی سے بھی کر لے۔''

احمر سے اس معاملے پر تمام تر ناراضگی بھلا کر وہ بیٹیوں کو چپ کرا دیتیں۔ وہ جانتی تھیں احمر خاصا نہیں بلکہ بہت زیادہ حسن پرست ہے، سو ماں بیٹیوں نے اسے ایک سے بڑھ کر ایک حسین صورت دکھائی تھی، انہیں حیرت تھی ان میں سے کوئی بھی ان کے بیٹے کو متاثر نہیں کر سکی تھی۔

'' اس کی بھنویں کتنی سیدھی ہیں ذرا کمان دار نہیں۔''

''ہونٹوں کا کٹاؤ اس والی کا مسکراہٹ میں ذرا دلکشی نہیں پیدا کرتا۔''

''توبہ میں تو کسی مردانہ نما آواز والی نہ پسند کروں، نازش تم نے خواہ مخواہ زحمت کی اتنی۔''

اپنی ناپسندیدگی طرح طرح سے ظاہر کر کے وہ بڑے اطمینان سے الگ ہو جاتا۔ اب ماں بیٹیوں کو چاہے دوسروں کے سامنے کتنی ہی معذرتیں پیش کرنی پڑتیں کہ کیوں ان کے بیٹے، بھائی کو سنگ مرمر سی تراشی یہ مورت پسند نہ آئی۔ اب تو ان کے حلقہ احباب میں بھی منفی سا تاثر احمر اور اسکی فیملی کے بارے میں بنتا جا رہا تھا کہ یہ اچھی بھلی دلکش لڑکیوں کو صرف مسترد کرنے کے لئے دیکھتے ہیں۔ سال ہوا نازش اور بینش دونوں نے اس معاملہ میں اپنی دخل اندازی ختم کر دی تھی کہ دونوں ہی کے سسرالوں کی لڑکیوں کو بھی اس نے مسترد کر دیا تھا اور دونوں نے ہی احمر اور گھر والوں کے بارے میں چبھتے تبصرے سن لیے تھے ''اچھی بھلی بیگم نور اس دن اپنی بہن کو لا رہی تھیں بھانجے کے لیے ہماری بیٹی دکھانے، لیکن بھئی ہم نے سوچا بینش کی ممی سے پہلے مل لیتے ہیں، ہمیں کیا معلوم تھا ان کے بھائی کو ہماری حور یہ پسند ہی نہیں آئے گی۔''

بینش کی پھوپھی ساس خاصے غصے میں تھیں اور بینش کا بے تاثر چہرہ انکو مزید اشتعال دلا رہا تھا۔

''بی بی آئندہ ہمارے خاندان کی کسی لڑکی کے لئے اپنی ماں بھائی کو نہ لانا، یہاں ایک سے ایک ہیرا لڑکی ہے، کانچ کا ٹکڑا نہیں کہ کسی کو پسند نہ آئے۔'' ان کی بات میں اب زیادہ مبالغہ آرائی بھی نہ تھی، واقعی بینش کے سسرال میں ایک سے بڑھ کر ایک خوش

ادالڑکیاں تھیں، اس لیے بیگم نور سے اس دن جب بینش کے میکہ کی آمد کی بنا پر ملنے سے معذرت کی گئی تھی تو انہوں نے حوریہ کو چھوڑ کر بینش کی تائی ساس کی بیٹی پسند کر لی تھی۔ اسی دن دیکھا اور اسی وقت رشتہ بھی دے دیا۔ اچھا بھلا رشتہ اپنے گھر آتے آتے چلا گیا۔ اس کا افسوس پھوپھی ساس کو خاصا تھا، گو بھتیجی کا رشتہ ہونے پر کوئی جلن نہ تھی لیکن حوریہ کا مسترد ہونا ان کے لئے خاصا دھچکا تھا۔ مزید یہ کہ دوسرا رشتہ بھی جو ہر لحاظ سے مناسب تھا ہاتھ سے نکل گیا۔

بینش بے چاری خاصی ندامت محسوس کر رہی تھی لیکن اس سارے معاملہ میں احمر کے سوا کوئی بھی قصور وار نہ تھا۔ احمر کو حوریہ کی انگلیاں پسند نہ آئی تھیں۔ اس میں کوئی آرٹسٹک ٹچ نہیں تھا اس کے بقول اب بھلا کیا یہ اعتراض انہیں یعنی حوریہ کے گھر والوں کو بتا کر اس نے اپنی شامت کو آواز دینا تھی کہ فوراً ہی کہا جاتا کہ ''اپنی بہن کی دیکھی ہیں، انگوٹھی ہی پھنس گئی تھی منگنی والے دن'' بینش کی چوڑی چوڑی انگلیوں میں منگنی کی انگوٹھی کا پھنس جانا خاصا یادگار مزاحیہ واقعہ کے طور پر مشہور ہو چکا تھا۔ بائیں ہاتھ میں پہنی انگوٹھی کی ناپ کے مطابق لی گئی انگوٹھی اس یادگار دن کسی بھی طرح دائیں انگلی میں صحیح طرح فٹ نہیں بیٹھ رہی تھی اور بینش دلہن بنی خوب خفت محسوس کر رہی تھی۔ اب بھلا کیا وہ بتاتی کہ آخر اس کے بھائی کو حوریہ کیوں ناپسند ہوئی۔ بالآخر اس نے یہ جواز گھڑا کہ حوریہ کا سرو قد ہونا احمر کو اپنے متوسط قد کے ساتھ سوٹ کرتا نہیں لگا۔

اس کے بعد نازش نے اچھی طرح اپنے طور پر دیکھ بھال کر کے اپنے میاں کی کسی کزن کی بیٹی کسی بہانے سے احمر کو دکھائی تو اسکی ساس کو علم ہو گیا، انہوں نے خاصی دلچسپی کا اظہا کرتے ہوئے بہو کو یہ بھی جتا دیا کہ ''ہمارے ہاں لڑکوں کو لڑکیاں بغیر کسی رشتہ ناطے شوپیس کی طرح دکھائی نہیں جاتیں اس کو اپنے سسرال کے اصولوں کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔''

نازش ان کی سرزنش سے چوکنا ہو چکی تھی۔ بینش کی بھائی کی شادی کی کوشش میں ہوئے سسرالی واقعہ کی گڑبڑ نے اسے ویسے ہی محتاط کر دیا تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ مدیحہ میں اسے کوئی اعتراض نہ ہوگا، پاؤں کے ناخن سے لے کر سر کے بالوں تک اس نے خوب غور کیا تھا۔ شاید اتنا غور اپنی تعلیم میں یا اپنی خانگی امور کے کسی بھی پہلو پر کرتی تو دانش وری کی ڈگری مل ہی جاتی۔ بس اس کو پورا یقین تھا کہ احمر مدیحہ کو پہلی نگاہ میں او کے کر دے گا مگر بھلا ہو مدیحہ کی آواز کا جس میں کوئی جلترنگ نہ تھا۔ سو احمر نے بہن کی ساری کوششوں اور یقین پر ایک ہی منٹ میں خط تنسیخ پھیر دیا۔ نازش نے دانت کچکچا کر غائبانہ مدیحہ کو ہی کوسا جو اچانک کسی سے مصروف گفتگو ہو گئی تھی اور کچھ انچ کے فاصلے پر اوٹ میں کھڑا احمر بہ خوبی اس کو سن رہا تھا۔

''توبہ نازش کیا اس لڑکی کا ووکل کارڈ Vocal Cord خراب ہے؟'' احمر نے اتنی بے فکری سے مدیحہ پر تبصرہ کیا کہ نازش کے ذہن میں جواب دینے کے بجائے ساس کا خیال ابھر آیا۔

''پوری ایجنٹ 007 ہیں۔ عین موقع پر نمودار ہوگئیں جب میں احمر کو مدیحہ دکھا رہی تھی، اب ان کو کون بھگتے گا، پھر میری کلاس ہوگی۔'' اس کے ذہن میں اپنی فکر سوار ہوگئی تھی۔ سو بھائی پر ایک برہم نگاہ ڈال کر وہاں سے ہٹ گئی جہاں احمر اب اپنا پسندیدہ اسپورٹس چینل دیکھنے میں منہمک ہو چکا تھا۔

''اعمال اچھے ہوں تو ایک چھوڑ ۷۲ حوریں ملیں گی۔ بس اب ہدف وہی کر لے یہاں دنیا میں کہاں بے عیب چیزیں عیب والے انسان کو ملی ہیں۔'' نازش کی ساس نے ناراضگی بھری سنجیدگی سے سب کے سامنے اس کو سنا دیا تو اس کا چہرہ پھیکا سا ہوگیا۔ بس پھر دونوں بہنوں نے مزید کسی مہم جوئی سے توبہ کر لی۔

رہا احمر تو وہ کسی معاملہ میں بے نیاز ہو یا نہیں لیکن اس معاملہ میں وہ ایسا بے نیازی کا انداز اپناتا تھا کہ حیرت ہوتی تھی، اتنا خیال اور دھیان رکھنے والا بیٹا اور بھائی کیسی بے حس دیوار بن جاتا ہے۔

''احمر اب تمہیں سنڈریلا کہ بجائے سانڈریلا دیکھنی پڑے گی۔ موٹے ہو رہے ہو۔''

ابو نے ہنستے ہوئے اسکی جسامت کی جانب اشارہ کیا جو فربہی کی جانب مائل ہوگئی تھی۔ آفس سے کچھ دیر قبل گھر آئے احمر نے چونک کر باپ کو دیکھا جو اپنے دوستوں کے ساتھ واک پر جانے کے لئے گھر سے نکل رہے تھے، ذرا کی ذرا رک کر انہوں نے آرام دہ انداز میں بیٹھے بیٹھے بیٹے کو رک کر غور سے دیکھا اور تبصرہ کرتے آگے بڑھ گئے۔ بس پھر اگلی شام کو کام سے واپسی میں احمر کی گاڑی کا رخ جم کی جانب ہو چکا تھا وہ وہاں کا ممبر تھا، لیکن کچھ مہینوں سے ادھر کا رخ ہی نہ کیا تھا۔ ابو کی بات نے اس کو خاصا شاک کر دیا تھا کہ وہ اب سانڈریلا کا مستحق ہے۔

گاڑی میں اپنے ساتھ لائے جوتوں اور کپڑوں کا تھیلا ہاتھ میں تھامے جب وہ جم میں داخل ہوا تو اس کا انسٹرکٹر 'براؤن' اپنے لیے مخصوص سیٹ پر موجود تھا۔ احمر کو دیکھ کر اس نے خوشدلی سے ہاتھ ہلایا ''تم مسٹر سے مولوی بنتے جا رہے ہو ینگ مین۔'' اس نے قریب آتے ہوئے احمر کو آنکھ ماری تو وہ زبردستی مسکراتا ہوا چینجنگ روم کی جانب بڑھ گیا ''اور تم براؤن سے بلیک!'' وہ اپنا تبصرہ دل میں روک کر اپنی مخصوص ورزشوں میں مصروف ہوگیا۔ قدآدم آئینے اسے بتا رہے تھے کہ وہ واقعی پھیل چکا ہے، اسے حیرت تھی کہ اس نے یہ نوٹ کیوں نہیں کیا حالانکہ وہ اپنی شخصیت کو فٹ رکھنے میں خاصا الرٹ تھا۔ براؤن کی بات اسے خاصی چبھی تھی۔ اس نے اس کے بڑھے ہوئے پیٹ کی

جانب اشارہ کیا تھا۔ خودوہ حقیقی معنوں میں جم ٹرینر تھا۔ ورزشی جسم اور پھرتیلا۔ اپنی عمر وہ پچپن سال بتاتا تھا لیکن اس کی تیزی سے کی گئی حرکات وسکنات سے لگتا نہ تھا کہ یہ اس عمر کا ہوگا۔ پچھلے سال ہی اسکی تعیناتی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے جو انسٹرکٹر تھا احمر کی اس خوش شکل نوجوان سے اچھی ہائے ہیلو تھی۔ اسکے بعد براؤن آیا تو احمر کو ذرا پسند نہ آیا۔ یہ براؤن تو بالکل براؤن کاغذ کی طرح ہے، دیکھ کر ذرا بھی دل خوش نہیں ہوتا، احمر نے ساتھی سے سرگوشی کی تو وہ بھی ہنس پڑا۔ ''فیکا'' اچھا تھا۔ اس نے پرانے کو یاد کیا اور براؤن پر پھر ایک ناگوار نگاہ ڈالی تو اتفاق سے دونوں کی نگاہیں چار ہوگئیں تو براؤن بڑی خوشدلی سے مسکرادیا۔ احمر نے فوراً ہی نگاہ پھیر کر سامنے رکھے ڈبلز کی جانب کرلی اور پھر مصروف ہوگیا۔

براؤن کے آنے کے بعد سے احمر کے جم جانے میں اتنی باقاعدگی نہ رہی تھی۔ روزانہ جانے کے بجائے وہ ایک دن چھوڑ کر جانے لگا تھا، جبکہ اس کا جم میں بنا دوست فہد باقاعدگی سے آنے کی بنا پر اسی طرح فٹ تھا جیسے احمر نے مہینہ بھر پہلے اسے دیکھا تھا۔ احمر کو اتنے دنوں بعد دیکھ کر اس نے بڑی پرجوش ہائے ہیلو کی۔ کتنوں نے احمر پر براؤن کی طرح مختلف تبصرے کیے، جنہیں مسکرا کر سنتا ہوا وہ پسینہ بہانے میں مصروف رہا۔

''تو تم براؤن کی وجہ سے غائب تھے؟'' فہد نے تولیہ سے گردن کا پسینہ پوچھتے ہوئے دھیمی آواز میں احمر سے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''سنڈریلا کی تلاش میں تھا۔'' احمر نے ابو کی بات یاد کرتے فہد کو ہنستے ہوئے جواب دیا۔

''آج کل سنڈریلا تلاش کون کرتا ہے پیارے، ایک چھوڑ دس سنڈریلا ملیں گی، اشارہ کرنے کی دیر ہے بس۔''

فہد نے آنکھ مارتے ہوئے احمر کے بازو پر بھی ہاتھ مارا ''اس براؤن کی بھی بیٹی ہے بس وہ براؤن سنڈریلا ہے۔'' اس نے سرگوشی کا سا انداز اختیار کرتے ہوئے براؤن کی طرف آنکھ کا اشارہ کیا تو احمر نے منہ بنالیا۔

''میرا ذوق اتنا خراب نہیں ہوا۔''

''نہ نہ بری نہیں ہے بس براؤن ہے۔'' فہد اب اس کو چڑا رہا تھا۔

''ہاں جیسیکا بولو کیا کام ہے، آئندہ مجھے فون کرنے کی ضرورت نہیں۔'' ورزش سے فارغ ہوکر احمر واش بیسن میں کھڑا ہاتھ منہ دھو رہا تھا کہ اسے براؤن کی ناراضگی بھری آواز سنائی دی، قریب بنے چینجنگ روم میں کھڑا وہ اپنے سیل پر کسی سے بات کررہا تھا۔ عمومی طور پر اس نے براؤن کو بہت ٹھنڈے مزاج کا آدمی پایا تھا۔ اس میں برداشت کا بہت مادہ تھا لیکن جیسیکا سے بات کرتے ہوئے وہ خاصا برہم لگ

رہا تھا۔

بات ختم کر کے وہ جانے لگا تو اس کی نظر احمر پر پڑی، احمر کو آج اس کی نظروں میں کڑواہٹ سی گھلی لگی جس نے اس کے براؤن رنگ کو مزید بے رونق کر دیا تھا۔ کندھے اچکاتا ہوا وہ بے خیالی میں اس جیسیکا کے بارے میں سوچنے لگا جسے براؤن نے خوب سنائی تھیں۔ نہ جانے کیا قصور تھا بیچاری کا جو اس سے تمام رشتہ ناتے توڑنے کی باتیں کر رہا تھا۔

''اچھا ہے، توڑ دے اس کے ساتھ رہ کر بندہ کونسا خوش رہ سکتا ہے۔'' بے کار کا تجزیہ کر کے اس نے اپنا سامان اٹھایا اور سب کو ہاتھ ہلاتے ہوئے جم سے باہر قدم بڑھا دیئے۔''کم بخت انگریزی بڑی اچھی بولتا ہے۔'' جیسیکا سے بات کرتے ہوئے براؤن رواں انگریزی بھی بول رہا تھا اور انگریزوں سے متاثر ہوئے ذہنوں کے لئے یہ خوبی خاصی عظیم ہوتی ہے۔ احمر کے ذہن و دل میں براؤن کے لیے گنجائش اچانک ہی ہوگئی تھی۔ اس کی انگریزی نے اس کا رتبہ بنا دیا تھا۔

گھر جانے سے پہلے اس نے گاڑی کا رخ اپنے مخصوص اسٹور کی جانب کر لیا تھا۔ امی نے کچھ فروزن فوڈ اور آئس کریم کے پیکٹ لانے کی ہدایت کچھ لمحوں قبل ہی سیل فون پر دی تھی۔ ورزش کے بعد وہ اپنے آپ کو خاصا تازہ محسوس کر رہا تھا۔ اسٹور کی عقبی گلی میں گاڑی پارک کی۔ اس نے سرسری نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا تو خوبصورت سرخ گلاب اور بیلے کی کلیاں تھامے وہ بچی نیند میں بے سدھ سیمنٹ کے بینچ پر بیٹھی تھی۔ نیم اندھیری اس گلی میں زیادہ تر عمارتیں مختلف کمپنیز کے آفس یا گودام کے طور پر کام آتی تھیں۔ اس وقت ادھر کوئی چہل پہل نہ تھی۔ کام کے اوقات ان اداروں کے ختم ہو چکے تھے۔ کچھ رہائشی پلاٹ بھی تھے لیکن ان میں بھی خاموشی چھائی تھی۔ ایک مخصوص حصہ تک ہی لوگ ادھر اپنی گاڑی پارک کرتے تھے۔ بھرپور روشنی نہ ہونے اور حالات کا ڈر لوگوں کو اندھیرے کے بعد اس گلی میں گاڑی پارک کرنے سے روک دیتا تھا۔ بینچ پر اسٹور میں آئے گاہکوں کی گاڑیوں کی روشنیاں گاہے بہ گاہے لہرا رہی تھیں۔ گلی کے بالکل شروع میں اسٹور ہی کے ساتھ جڑا وہ بینچ شاید اسٹور کے ملازمین ہی کی سہولت کے لئے بنایا گیا تھا جہاں وہ دنیا اور اس کی خوبصورتی اور بدصورتی سے بے نیاز ہاتھوں میں خوشبو تھامے سو رہی تھی۔ دس بارہ سال کی وہ معصوم سی بچی جس کے میلے کچیلے حلیہ سے احمر کو اس سے چڑ کی سی کیفیت محسوس ہونے لگی اور وہ سر جھٹک کر کی چین جھلاتا ہوا اسٹور کے روشن چہرے کی طرف بڑھنے لگا۔ اچانک اسے اپنے عقب سے فکرمند آواز ابھرتی سنائی دی۔ بے اختیار اس نے گھوم کر دیکھا تو کوئی لڑکی اس پھول والی بچی پر جھکی اس کو جگانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''لو جی آ گئیں کوئی مدر ٹریسا!'' اس نے پھر قدم

بڑھا دیئے۔

''سنیئے مسٹر کیا آپ میری کچھ مدد کر سکتے ہیں؟'' احمر نے گردن موڑی تو اپنی شفاف مانگ کے ساتھ سارا کھڑی تھی۔ سارا کو کھڑا دیکھ کر وہ کچھ گڑبڑا سا گیا، خود بہ خود اس کے قدم قریب جا کر رک گئے۔

''لیونارڈو کی مونالیزا اس گلی میں!'' بے اختیار یہ جملہ اس کے ذہن میں ابھرا اور مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو گئی۔

(جاری ہے)

☆☆☆

میری لائبریری سے

کتاب کا نام : کلام مینا

مصنفہ (شاعرہ) : بنت مجتبیٰ مینا

پبلشر : منشورات

امت مسلمہ کے پہلو میں ہزار ہا انعامات و اکرامات ہیں جن میں سب سے بڑی نعمت ''امت محمدیہ'' کا اعزاز ہے۔ حضرت محمد ﷺ کا نام لینے پر ہی اللہ دس نیکیاں بڑھا کے دس گناہوں کی بخشش کا اعلان کرتا ہے باقی حساب کتاب خود کر لیں۔ ہاں آپؐ کا عرب میں پیدا ہونا دو نمایاں وجوہات کی بناء پر تھا۔ ایک تو یہ کہ محبوبؐ خدا کی دعوت کو قبول کرنے والوں کا ''یکسو'' ہونا، منافقت اور دوغلے پن سے پاک ہونا۔ اس لیے ماننے والے اصحاب کالنجوم (میرے صحابہؓ ستاروں کی مانند ہیں) ٹھہرے اور نہ ماننے والے ابولہب ابوجہل۔ درمیانہ راستہ عربوں کے پاس نہیں تھا۔ دوسری صفت، عربوں کا فصیح اللسان ہونا ہے۔ اس فصاحت و بلاغت میں شاعرانہ مزاج بھی شامل تھا۔ آپؐ کی فصاحت و بلاغت پر تو ایک زمانہ کیا خود عرش والا بھی رطب اللسان ہے۔ روایات میں ہے کہ آپؐ نے ایک صحابی سے فرمائش کی کہ فلاں شاعر حکیمانہ اشعار کہتا ہے کوئی شعر (اس کا) یاد ہو تو سناؤ۔ انہوں نے ایک شعر سنایا۔ آپؐ نے فرمایا اور سناؤ وہ صحابی کہتے ہیں۔ حتیٰ انشدتُ مأ تہ بیت (یہاں تک کہ میں نے سو اشعار سنا ڈالے) سیرت کی کتب سے پتہ چلتا ہے کہ چوبیس صحابہ کرام خود شاعر تھے۔ خود سیدہ عائشہؓ اشعار کو سننا پسند کرتی تھیں اور ان کے دو شعر زبان زد عام ہیں (سیرت کے پروگرام کے لئے میں نے تو ضرور سنانا ہوتے ہیں)

لنا شمس وللآفاق شمس

وشمسی خیرٌ من شمسِ السمآء

فان الشمس تطلع بعد الفجر

وشمسی طالع بعد العشاء

(ایک میرا سورج ہے اور ایک آسمانوں کا سورج ہے، میرا سورج آسمان کے سورج سے زیادہ بہتر ہے، آسمان کا سورج فجر کے بعد طلوع ہوتا ہے اور میرا سورج عشاء کے بعد) جی جناب! آمدم برسر مطلب! ضرور سمجھ گئے ہوں گے کہ آج شاعری کی کوئی کتاب ہے۔

کتاب کا نام ''کلام مینا'' اس ہستی کا کلام جو نمود و نمائش، ریاکاری سے کوسوں دور اور اصلی حسبی نسبی شاعرہ تھیں۔ ادب برائے زندگی اور زندگی برائے بندگی کے ضمن میں اگرچہ شاعری کا دامن اتنا وسیع نہیں پھر بھی چند ایک نام ہی سب پہ بھاری ہیں۔ بنت مجتبیٰ مینا نے بہت کم شاعری کی لیکن ان کا ہر شعر انگوٹھی میں جڑا نگینہ ہے۔ روانی، سلاست ترنم یہ سب ان کی شاعری کے بنیادی

لوازمات ہیں۔ یہ کتاب مجھے سال گزشتہ میں منشورات کے زبیر عابد صاحب کے توسط سے ملی تھی اور میری کتابوں کی الماری میں تبصرہ کی منتظر!

بنت مجتبیٰ مینا بہت اچھی نعت نگار بھی تھیں۔ صرف نعت نگار نہیں ہنر مند نعت نگار، ایسی زندہ نعت کہنے والی کہ ہر لفظ زندگی سے بھرپور۔ آئیں نعت سے پہلے ان کے چند حمدیہ اشعار سے باقاعدہ آغاز کریں۔

یہ زمیں دیکھوں آسماں دیکھوں
تری قدرت کہاں کہاں دیکھوں
مری آنکھوں میں یوں بسا ہے تو
تو ہی تو ہے جہاں جہاں دیکھوں
تو عظیم تر ہے گمان سے
تو قریب تر رگِ جان سے
تو دکھی دلوں کے قریب ہے
تجھے ڈھونڈتے ہیں کہاں کہاں

نعت مقبول سے چند اشعار

وہ ہے بحر سخا وہ ہے گنج عطا
وہ دعائے خلیل اور حبیب خدا
اس کی شانِ سخاوت پہ لاکھوں سلام
یہ جی میں ہے کسی صورت تمہارے در پہ جا پہنچوں
وہی دیوار و در دیکھوں مدینے کی زمیں چوموں
نظریں اٹھا کے گنبدِ خضرا کو چوم لوں
آنسو گرا کے نقشِ کفِ پا کو چوم لوں
میں کیا کروں مولا میرے بس میں کچھ نہیں
طیبہ کے ذرہ ذرہ کو ، صحرا کو چوم لوں

کچھ نعتیہ اشعار اتنی مختصر مگر مترنم بحر میں ہیں کہ جی جھوم جھوم جاتا ہے۔

وہ ہمارے نبیؐ
سب سے پیارے نبیؐ
کیا برا کیا بھلا
سب بتایا ہمیں
ان پہ جاں ہے فدا
وہ حبیب خدا

اور

ان کا آنا کیسا آنا
جیسے چمکا چاند افق پر
ان کی خوشبو ہر سو پھیلی
پورب پچھّم دکھن اتر
ان کی جود و سخا کا عالم
کہیے مینا کہیے مکرر

شاعر کے نام کو مقطع میں استعمال کرنے کا ہنر کیا اس سے اچھا بھی ہوا ہوگا؟

ایک بڑے سے بڑا افسانہ نگار کوزے کو سمندر میں تبدیل اور شاعر سمندر کو کوزے میں بند کر سکتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے یہ قطعات۔

گرمیوں میں کسی مسافر کو

جیسے دوپہر ہوتی جاتی ہے
بس اسی طرح سے یہ عالم ہے
زندگی قہر ہوتی جاتی ہے

؎جوں ہی اس کو اذن سفر ملا
میرے خاک داں سے گزر گیا
میری چشم نم رہی ڈھونڈتی
وہ کہاں گیا ؟ وہ کدھر گیا

؎جانے کس واسطے آئے ہیں تری دنیا میں
جانے کب جانے کی آجائے ہماری باری
پھر یہی بات کتابوں میں لکھی جاتی ہے
سب اسی بات کو دہراتے ہیں باری باری

اپنا ماضی ہر کسی کو محبوب نہیں ہوتا کوئی تو اسے عذاب قرار دیتے ہیں لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ بنت مجتبیٰ مینا کا ماضی کس قدر شاندار تھا۔ اس کی یاد کس طرح آتی ہے؟

؎ کیوں بیٹھے بیٹھے آنکھوں میں اک بوند چھلک کر آتی ہے
کچھ بھولی بسری سی شکلیں ہر سمت دکھائی دیتی ہیں
اک لرزش اک چمکارہ سا ہوتا ہے نظر کے دامن میں
آنسو سے ٹپکنے لگتے ہیں آہیں سی سناتی دیتی ہیں

بہت پہلے پروفیسر فروغ احمد مرحوم سے شاعروں کا تذکرہ ہوا تو کہنے لگے ''اگر شاعروں کی شاعری پڑھتے ہوئے ان کا کردار سامنے رکھا جائے تو افسوس سے کہنا پڑتا ہے اردو شاعری کا دامن تنگ ہی ہے۔ سوائے چند ایک ناموں کے جنہیں ترقی پسند ''بڑا'' قرار نہیں دیتے۔''

خیر ہمیں ان سے کیا لینا دینا۔ بڑے شاعروں کی عظمت کا سرٹیفکیٹ تو روز حشر اللہ ہی دلوائے گا بس یہ قطعہ پڑھ لیجیے۔

؎ذکر حضورؐ پاک پہ قربان جایئے
ٹکڑے ہزار دل کے حضوری میں لایئے
پلکوں کا فرش راہ گزر میں بچھایئے
دل کے لہو سے شمع محبت جلایئے

چراغ راہ میں شائع ہونے والی نظم کے اشعار دیکھیے:

؎ساز ہستی پہ کوئی گیت نہ گایا میں نے
قہقہہ کیا تبسم بھی نہ پایا میں نے
مجھ کو الجھائے رہی عقل و خرد کی گتھی
مطربِ شوق کہاں ساز بجایا میں نے
زندگی ٹھہر ذرا اور ابھی ٹھہر ذرا

بنت مجتبیٰ مینا کی شاعری ہلکے ہلکے سروں میں دھیمے دھیمے سوز کے رنگ ہیں۔

؎نہ لائے کوئی یہاں شمع آرزو ورنہ
حریم دل کے یہ مہمان جاگ جائیں گے
نہ چھیڑ دیدۂ مینا چھلک اٹھیں گے ندیم
الم کدے کے نگہبان جاگ جائیں گے

ہم کہہ نہ سکے تم سن نہ سکے
جو بیتی دل پہ بیت گئی
جب بگڑے سمجھو بنتی ہے
جب ہارے جانو جیت گئی

ہاں ذات کا دکھ اپنی جگہ وطن کی بات ہمیشہ امید سے کرتی ہیں۔ان کی نظم ''پہلی کرن'' کیا جاندار ہے۔

کیا اندھیاری چھٹ جائے گی
تاریکیِ غم مٹ جائے گی
کیا شام الم کٹ جائے گی
سچ کہنا ارے یاران وطن
چمکی ہے افق پہ پہلی کرن

پھران کی کچھ اور نظمیں ''غازیانِ تازہ دم، کس کی آواز ہے یہ، ہلال عید'' زبردست پیغام لیے ہیں۔

اے ہلال عید پیغام خوشی لاتا ہے تو
یادلِ خوں گشتۂ مسلم کو تڑپاتا ہے تو
تو یہاں آتا ہے شاید مسکرانے کے لئے
یہ جہاں آنسو نہیں ملتے بہانے کے لئے
تو ہمارا ہے تو پھر انداز بیگانہ ہے کیوں؟
اے ہلال عید یہ طرز جداگانہ ہے کیوں؟

ان کی طویل نظم ''کس طرح مسکراؤں'' واردات قلبی سے بھرپور ہے۔حالات حاضرہ کو سالوں پہلے نظم میں سمو کر پیش کیا۔آج بھی انہی حالات کی ترجمان ہے۔ان کی نظموں بلکہ شاعری کا اپنا رنگ ہے تاہم ''اک لڑکی، ہارسنگھار'' وغیرہ میں ابن انشاء کی شاعری کی جھلک ہے۔انہوں نے اپنے بچپن کو ''میں اکثر سوچا کرتی ہوں۔'' میں ایسی خوبصورتی سے سمویا ہے کہ پڑھنے والے پر سحر طاری ہوجاتا ہے۔

ان کی زندگی کو ذہن میں لاؤں تو سوچتی ہوں ان کی شاعری زیادہ نکھری نکھری ہے یا ان کی شخصیت۔

''رات گزر جائے گی'' میں زندگی کے اسرار و رموز ملتے ہیں۔''لاہور کی مٹی'' مختصر سی نظم۔

لاہور کی مٹی ہے سوا تاج محل سے
اس مٹی کی خوشبو تو کہیں اور نہیں ہے
رہتے ہیں یہاں بھی کئی دیوانۂ الفت
لاہور بھی اس رسم میں پیچھے تو نہیں ہے

آپا جی حمیدہ بیگم کے انتقال پر، بنت الاسلام کی وفات کی خبر سن کر اور مولانا مودودی کی رحلت پر کہے اشعار دل کی داستان سناتے ہیں۔

اپنے بھائی کی شادی پر کہے سہرے کے اشعار کیا غضب ڈھاتے ہیں۔پورا شجرۂ نسب بیان کیا ہے۔ان کی شاعری میں ہر لفظ اپنی مثال آپ ہے۔غزل حسن و عشق کے رنگوں پر محیط ہے تو نظموں میں نغمگی کی اپنی ہی شان ہے۔ بنت مجتبیٰ مینا نے اپنی زندگی میں قلم کو بس شاعری کے لئے نہیں استعمال کیا انہوں نے افسانے، مضامین جو بھی لکھا خوب لکھا۔ماہنامہ نور کی سالہا سال سے مدیرہ تھیں اور بچوں کی ذہنی سطح کے مطابق اس کو

چلایا۔

؎اس حسنِ پاکباز کی آتی رہے گی یاد
نورسحر کے ساتھ کبھی چاندنی کے ساتھ

غنچہِ نا شگفتہ کی طرز نے رکھ لیا بھرم
ورنہ حیاتِ لالہ رنگ داغ ہی داغ ہے تمام

اگلے ماہ تک کے لئے فی امان اللہ..... بشرط زندگی!

☆☆☆

سامیہ احسن

ایک خوشگوار شام

لاہور میں ہونے والی حریمِ ادب کی روداد

خواتین کی محفلِ حریمِ ادب کی روایت کافی پرانی ہے۔ گزشتہ کئی سالوں سے بلاتعطل ہر ماہ کی آخری جمعرات کو 11 تا 1 بجے کے درمیان ۱۲ فصیح روڈ اسلامیہ پارک لاہور میں یہ محفل منعقد ہوتی ہے۔ جس میں شعروادب سے دلچسپی رکھنے والی خواتین اور بچیاں شرکت کرتی اور اپنی تخلیقات سناتی ہیں۔ شرکائے محفل پڑھی گئی تحریروں پر تنقید وتبصرہ کرتے ہیں اور یوں لکھنے والوں کو مثبت رہنمائی میسر آتی ہے۔

سال میں ایک دفعہ وسیع پیمانے پر حریمِ ادب کا انعقاد کسی دوسرے مقام پر کیا جاتا ہے۔ اس سال یہ ادبی نشست محترمہ آسیہ راشد (نائب مدیرہ ماہنامہ ''بتول'') کے گھر پر ہوئی۔ مہمان خصوصی محترمہ ثریا اسما (مدیرۂ اعلیٰ ''بتول'') تھیں۔ میزبانی کے فرائض ڈاکٹر فرات غضنفر نے انجام دیئے۔

ادبی نشست کا آغاز شام چار بجے ہوا۔ ابتدا نوعمر اور نوآموز لکھنے والوں سے ہوئی۔ نور نے ''سچا انعام'' سنائی جو کہ ایک اچھی سبق آموز کہانی تھی۔ ردا کی کہانی ''ننھی کلی'' بچوں میں مثبت سوچ کو ابھارنے کی ایک اچھی کوشش تھی۔ ان بچیوں کے بعد نوشین جمیل نے بچوں کے لئے اپنی کہانی ''کاہل بلی'' سنائی جو جرمن زبان کی کہانی سے ماخوذ ہے اور اسے انہوں نے ماہنامہ ''نور'' کے آئندہ آنے والے خاص نمبر ''لوک کہانی نمبر'' کے لئے تحریر کیا ہے۔ نہ صرف کہانی بے حد دلچسپ تھی بلکہ نوشین جمیل کے اندازِ تحریر نے اسے چار چاند لگا دیئے تھے۔ نوشین کی کہانی کے بعد شہزادی ام صائم نے حجاب کے موضوع پر اپنا مضمون پڑھا جس کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ حجاب قید نہیں بلکہ آزادی ہے اور ایک مومنہ کی پہچان بھی۔

محترمہ ریحانہ رفیق صاحبہ ایک سوشل ورکر ہیں اور آج کل مختلف رفاہی اداروں کے لئے کام کر رہی ہیں۔ انہوں نے لاہور میں پانچ سالہ بچی کے حادثے کی خبر کے حوالے سے میڈیا کے کردار سے متعلق اپنی تحریر پیش کی جس میں ایک حساس دل کا غم نمایاں تھا۔

محترمہ قمر پرویز صاحبہ جو ایک پرائیویٹ سکول کی پرنسپل بھی رہ چکی ہیں اور آج کل مختلف رفاہی اداروں سے منسلک ہیں نے اپنا افسانہ پڑھا جس میں ایک باحجاب لڑکی کا کردار دکھایا گیا تھا جو اپنے ماحول سے متاثر ہو کر حجاب اتار دیتی ہے۔ افسانہ دلچسپ تھا اور سنانے کا انداز متاثر کن تھا۔

روبینہ عاطف نے اپنی کہانی ''آدمی آدمی بناتے

ہیں'' پڑھی۔ یہ ایک پرلطف اور مؤثر تحریر تھی جو اصلاحِ احوال کے سلسلے میں انسانی عمل کی اہمیت کو واضح کرتی تھی۔

محترمہ نسرین سحرش نے جو کہ اپنی پرتاثیر اور جذبے سے بھرپور شاعری کے حوالے سے بہت پسند کی جاتی ہیں، عورت کی زندگی کے مختلف ادوار (بچپن، جوانی اور بڑھاپے) کے متعلق نظم سنائی۔ نظم حسبِ توقع بہت خوبصورت تھی اور عورت کے خیالات کی بہترین ترجمان بھی۔

مشہور افسانہ نگار محترمہ شاہدہ ناز قاضی نے پنجابی کی نظم سنائی جو بے حد سراہی گئی۔ اس کے بعد اپنا افسانہ ''جھیل اور پرندے'' سنایا جس کی کہانی عورت کی زندگی کے اس المیہ پہلو کی ترجمان تھی کہ وہ جو مرد کے تاریک راستوں کی بہترین ہمسفر اور غم گسار ہوتی ہے، روشنی میں آتے ہی مرد کے لئے ایک بے مصرف اور بے حقیقت وجود بن جاتی ہے جسے ایک کونے میں ڈال کر وہ بھول جاتا ہے۔ شاہدہ ناز قاضی نے عورت کے جذبات کو بہت خوبصورتی اور چابک دستی سے قلم بند کیا۔

افسانے میں منظر نگاری اور مکالمے بھی بے حد جاندار تھے۔

اس پر اثر تحریر کے بعد مدیرہ بتول صائمہ اسما کی باری آئی جنھوں نے پہلے محترمہ نجمہ یاسمین یوسف کی ارسال کردہ نظم ''سودائے تعارف'' سنائی وہ خود خرابیِ طبع کے باعث نہ آپائی تھیں۔ ان کی نظم بھی نسرین سحرش کی نظم کی طرح عورت کی زندگی کے مہ وسال اور عمر کے مختلف ادوار کا احاطہ کیے ہوئے تھی اور ہمیشہ کی طرح ان کی نظم کا آہنگ متاثر کن تھا۔ اس کے بعد صائمہ اسما نے ''اُن ﷺ کی یاد میں'' کے عنوان سے اپنا نعتیہ کلام سنایا جو ان کے شعری مجموعے ''گلِ دوپہر'' میں بھی شامل ہے اور عورت کے حوالے سے پیغمبرِ اسلام حضرت محمد ﷺ کی شفقت کا مظہر ہے۔ پھر انہوں نے اپنی غزل کے چند خوبصورت اشعار سنائے جنہیں بہت سراہا گیا۔

حلقۂ حریم ادب اور چمن بتول کے قارئین کی بہت پسندیدہ افسانہ نگار ربیعہ ندرت اس دفعہ افسانے کے بجائے مضمون لے کر آئی تھیں۔ مضمون سنجیدہ، پرمغز اور ان کے باریک بین مشاہدے، حساس دل اور واضح سوچ رکھنے والی شخصیت کا غماز تھا۔

ان کے بعد راقمہ نے اپنی حمد سنائی۔ اگر چہ فرات غضنفر، صائمہ اسما اور نسرین سحرش جیسی مستند اور منجھی ہوئی شاعروں کے سامنے مجھ جیسے بے قاعدہ اور اتفاقیہ شاعر کا اپنا کلام سنانا ایک جرأت مندمرحلہ تھا لیکن سر جھکا کر اس مرحلے سے گزر گئی۔ اس کے بعد بشریٰ غزل نے اپنی غزل کے چند اشعار سنائے۔ پھر ایک اور نو آموز شاعرہ مریم نے اپنی انگریزی نظم سنائی جسے ایک طالبِ علم کی فریاد کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

ام عبدمنیب نے اپنے تازہ لکھے ہوئے کتابچے

میں سے گرمیوں کے رمضان کے حوالے سے تحریر پڑھی جس میں صحابہ کرامؓ کے گرمیوں کے روزوں کا بیان تھا۔ دوسری تحریروں کی طرح ان کی یہ تحریر بھی وسیع مطالعے اور تحقیق کی مظہر تھی اور احتساب وعمل پر آمادہ کرنے والی تھی۔

آخر میں میزبان ڈاکٹر فرات غضنفر نے اپنے شعری مجموعے ''شام آنے کو ہے'' میں سے ایک نظم اور چند اشعار سنائے اور ہمیشہ کی طرح داد وتحسین سمیٹی۔ نشست کے اختتام پر راحیلہ سلمان غنی نے جو محترمہ زہرہ وحید صاحبہ کی دختر ہیں، پرسوز لہجے میں نعت سنا کر محفل کو گرما دیا۔ محترمہ ثریا اسمانے دعا کرائی۔

اس پروگرام کی سب سے خاص بات اس کا وقت پر اختتام ہونا تھا۔ پروگرام کے دوران وقت کو ضائع ہونے سے بچانے کا سہرا میزبان کے سر رہا جنہوں نے کسی لمحے بھی پروگرام پر اپنی گرفت کمزور نہیں پڑنے دی اور نہایت چابک دستی سے حاضرین کی توجہ کو مقصدِ محفل کی طرف مرکوز رکھا۔

دوران محفل ایک بات نہایت قابلِ توجہ دکھائی دی اور وہ لکھنے والوں کے موضوعات تھے۔ بیشتر تحریروں کا مرکز عورت کی ذات اور اس کے دکھ تھے جو اس بات کے غماز تھے کہ آج کی عورت میں شعورِ ذات بڑھ رہا ہے وہ اپنے استحصال سے باخبر ہوتی جارہی ہے لیکن ابھی بے بس ہے۔ استحصالی ہاتھوں کو روکنے کی سکت نہیں رکھتی۔ وہ منتظر ہے ایسے لمحوں کی جو اس کی ذات کا اثبات کریں، کسی ایسے مہربان کی جو اسے پھر سے معتبر کردے اور صائمہ اسما کی نعت ان سب خواتین کے دلی جذبات کی ترجمان تھی۔

حریمِ ادب کے لئے ہماری مشہور اور ہر دلعزیز افسانہ نگار قانتہ رابعہ نے، جو کہ بعض ناگزیر مصروفیات کی وجہ سے شریک محفل نہ ہوسکی تھیں، اپنا افسانہ ''کسب کمال کن'' بھجوایا۔ افسوس کہ وقت کی قلت اور پڑھنے والوں کی کثرت کے سبب یہ افسانہ سنایا نہ جا سکا جس سے حاضرین ایک خوبصورت تحریر سننے سے محروم رہے۔ تاہم امید ہے کہ یہ افسانہ چمن بتول کی زینت ضرور بنے گا۔ اور ہم اسے پڑھ کر لطف اندوز ہوسکیں گے۔

ایک بھرپور ادبی نشست کے بعد ایک بھرپور کھانے کی میز حاضرین کی منتظر تھی جو صاحبِ خانہ کے ادبی ذوق کے بعد ان کے ذوقِ طعام اور مہارت کی نمائندہ تھی۔ آسیہ راشد اور ان کے اہل خانہ کی محنت سے تیار کردہ ان تمام لوازمات سے بھی لوگ اسی طرح لطف اندوز ہوئے جیسے کہ ادب پاروں سے۔ گویا سماعت اور کام ودہن دونوں کو شادکام کرنے کا کافی مواد اس شام میں یکجا تھا۔

ہماری دعا ہے کہ حریمِ ادب کی یہ محفلیں یوں ہی سجی رہیں اور اس میں لکھنے والوں کی تحریروں میں روز بروز نکھار بڑھتا رہے آمین۔☆☆

رضیہ خان[1]

امریکہ یاترا اور گوری کے ساتھ مکالمہ

1982ء کی بات ہے۔ امریکہ یاترا کا شوق ہوا اور جولائی کے آخر میں ہم دومیاں بیوی سیر کو چل پڑے۔ جہاں تک تو امریکہ کی سیر کی بات ہے تو امریکہ واقعی بے حد خوبصورت اور بہت ہی بڑا ہے۔ ایک مکمل براعظم۔ 1982ء، 1999ء اور 2001ء میں لمبی لمبی سیریں کرنے کا اللہ تعالیٰ نے موقع دیا۔ اتنی طویل سیر کرنے کے باوجود امریکہ کا ایک کونہ بھی نہ دیکھ پائے ہوں گے۔

آج میں نے امریکہ کی سیر کے لئے یا اس کی خوبصورتی بیان کرنے لئے یا اس دوران جو عجیب وغریب واقعات پیش آئے ان کو بیان کرنے کیلئے قلم نہیں اٹھایا بلکہ میرا مقصد ایک امریکن گوری سے گفتگو کو بیان کرنا ہے جو دلچسپ بھی ہے اور عجیب بھی۔ آج شاید آپ یقین نہ کریں کہ ایسی جرأت بھی کی جاسکتی ہے مگر وہ بڑا پرامن دور تھا اور حقیقتاً ایسی ہی گفتگو ہوئی جو تحریر کرنے جارہی ہوں۔

جولائی کے آخری ہفتہ میں دو مہینے کی سیر کو نکلے۔ ایک ہفتہ انگلینڈ اور باقی دن امریکہ کنیڈا اور پھر امریکہ میں گھومے۔ زیادہ تر بس پر سفر کیا۔ ستمبر کے آخری ہفتے جبکہ واپسی کا سفر اختیار کرنے میں چار دن باقی تھے، ہم اور لینڈو کے بس سٹاپ پر بس کا انتظار کررہے تھے۔ بس سٹاپ پر میں میرے شوہر اوردو اور خواتین تھیں۔ یہاں سے ہمیں چار دن کے بعد واپس نیویارک اور پھر پاکستان روانہ ہونا تھا۔

میرا تجربہ ہے کہ برطانوی لوگ گفتگو میں نہ پہل کرتے ہیں اور نہ کھل کر بات کرتے ہیں۔ مختصر بات کریں گے اور پھر خاموشی۔ مگر امریکی لوگ خوش مزاج ہیں اور اگر موقع ہو تو اچھی گفتگو کر لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ کھل کر پوچھ لیں گے کہ یہ برقع آپ نے اپنی مرضی سے لیا ہوا ہے یا اپنے شوہر کی سختی کی وجہ سے پہنا ہوا ہے۔ تو اب ان میں سے ایک خاتون سے گفتگو شروع ہوئی کہ کہاں سے آئی ہیں، کیا کرتی ہیں، کہاں جارہی ہیں وغیرہ۔ کیونکہ میرے سخت پردے پر وہ حیران تھی۔ میں نے اور بھی حیران کر دیا کہ دو مہینوں کی اچھی خاصی سیر کے بعد چند دنوں تک واپسی ہے۔ پہلا سوال تو یہ کیا کہ تم پھر بہت رئیس زادے ہو گے کہ اتنی طویل سیر ذاتی خرچ پر کررہے ہو۔ خیر کسی طرح تشفی کرائی اگرچہ ہم رئیس نہیں ہیں مگر اس طرح کے اخراجات اپنی ذات پر کر سکتے ہیں۔

[1] سابق صدر شعبہ علوم اسلامیہ لاہور کالج یونیورسٹی لاہور

اب اصل سوال ہوا کہ امریکہ اور اس کے لوگوں کو کیسا پایا؟ جواب دیا کہ سچ سچ بتاؤں یا آدھا سچ آدھا جھوٹ، کیونکہ میں بلاوجہ کسی کی تعریف نہیں کرتی۔ اور اگر سچ سچ بتا دیا تو آپ کو ناگوار گزرے گا۔ اس نے کہا کہ اگر ایسی بات ہے تو سچ بیان کریں مگر دلائل دینا ہو ں گے۔ میں نے کہا امریکہ کے متعلق تو بات کرتے نہیں کیونکہ جغرافیائی خوبصورتی، حسنِ انتظام، قانون کی پاسداری، تہذیب، تنظیم، صفائی ستھرائی کسی شک وشبہ سے بالاتر تھے۔ اب رہی بات امریکیوں کی تو ان کے بارے میں فقط ایک فقرے میں اپنے تاثرات کا اظہار کروں گی کہ ''امریکی لوگ جانوروں سے بدتر زندگی بسر کر رہے ہیں۔'' وہ ایک طرح سے اچھل پڑی اور کہا کہ دلائل دو۔

میں نے کہا پہلی بات یہ کہ جانوروں کا کوئی حسب نسب نہیں ہوتا۔ نکاح ہو تو حسب نسب بنے۔ ہم انسانوں کے خاندان اور قبیلے ہوتے ہیں اور حسب نسب ہوتا ہے۔ اس طرح سے ہم انسانوں کی پہچان بنتی ہے کہ کون کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے یا قبیلے سے، اس کی عادات کیسی ہوں گی۔ ہمارے قرآن میں ہے کہ تمہیں خاندانوں اور قبیلوں میں تقسیم کیا ہے تا کہ تمہاری شناخت بن سکے جبکہ یہاں دو مہینوں کے مسلسل بس سفر میں اکثر خواتین کو یہ کہتے سنا کہ فلاں بس سٹیشن پر میرے بچے اور بوائے فرینڈ آیا ہوا ہوگا۔ میں پوچھتی خاوند یا بوائے فرینڈ تو جواب ملتا، نہ.....نہ توبہ، توبہ ہم نکاح کے جھمیلوں میں نہیں پڑتے۔ ایک سے اکتائے دوسرا اور دوسرے سے اکتائے تو تیسرا، نہ ہینگ لگی نہ پھٹکڑی اور آزادی حاصل ہوگئی۔ جبکہ طلاق کے لئے کورٹ جاؤ وغیرہ وغیرہ۔ اکثریت کا یہی جواب ہوتا کہ ہم نکاح نہیں فرینڈ شپ کرتے ہیں۔

میں نے یہاں 13، 14 سال کی بچیوں کو بچے اٹھائے اکیلیئے سیر کرتے اور سفر کرتے دیکھا ہے پوچھنے پر پتہ چلتا ہے کہ بوائے فرینڈ بچے کا تحفہ دے کر اکیلا چھوڑ کر چلا گیا ہے، اب اخراجات حکومت برداشت کرتی ہے اور ہم اکیلی اس طرح شوقِ سفر پورا کرتی ہیں۔ کبھی کبھی اس سیر کے دوران نیا بوائے فرینڈ بھی مل جاتا ہے۔

دوسری وجہ یہ کہ کیا آپ نے جانوروں کو لباس میں دیکھا؟ نہیں نا! لباس کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ جبکہ بعض علاقوں میں برف جمی ہوتی ہے اور درندے، جانور، پرندے بغیر لباس کے پھر رہے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسی جلدیں عطا کی ہیں جن کے لباس پہن کر وہ اپنی سردی زائل کرتے ہیں مگر امریکی لوگ نقطۂ انجماد سے کچھ عرصہ پہلے تک مختصر ترین لباس میں ہوتے ہیں بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ عورتیں تو کم از کم ننگی ہی ہوتی ہیں۔ صرف ایک سینہ بند اور جانگیہ اس کے علاوہ کوئی لباس نہیں۔ جب وہ ہم جیسی کسی خاتون کے

سر پر دوپٹہ دیکھیں تو حیرت میں ڈوب جاتی ہیں کہ سر کو بھی Cover کیا جاتا ہے؟ انتہائی سخت سردی میں بھی سرننگا ہی رکھتی ہیں۔ میں نے اسے بتایا کہ مجھے یہ عورتیں کم اور گوشت کے لوتھڑے زیادہ نظر آتی ہیں اور یہی حال مرد حضرات کا ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ عقل سے عاری درندے ہوں ، جانور یا پرندے، انہیں اپنی جنسی ضروریات پورا کرنے کے لئے کسی پردہ دار چیز کی ضرورت نہیں۔ کسی کمرے، اصطبل، دیوار کی آڑ یا چھت کی ضرورت نہیں۔ جہاں ضرورت محسوس ہوئی پوری کر لی۔ یہی حال آپ امریکی لوگوں کا بھی ہے۔ قطار میں کھڑے ہیں، کسی پلاٹ میں بیٹھے ہیں، دکانوں میں کھڑے ہیں، کہیں جا رہے ہیں، منہ سے منہ جڑا ہے اور گندی کمینی حرکتیں کر رہے ہیں۔ یہ مظاہرہ خالصتاً جانوروں والا نہیں؟ میری چوتھی دلیل یہ ہے کہ کہنے کو آپ لوگ صحت کا بہت خیال رکھتے ہی۔ ایسی خوراک کھاتے ہیں جو ہر طرح سے بڑی چھان بین کے بعد تیار کی جاتی ہے۔ سگریٹ کے پیکٹ پر بھی لکھا ہوا ہوتا ہے کہ اسکا پینا مضر صحت ہے۔ صفائی کا انتہائی خیال رکھا جاتا ہے۔ سڑک پر اگر کوئی چیز پھینک دے تو اسے جرمانہ ہوتا ہے۔ مگر آپ لوگ یہ جانتے ہوئے بھی کہ سور کا گوشت کتنا مضرت رساں ہے اسے کھاتے ہیں۔ سور کا گوشت جسم کے اندر جراثیم کی افزائش کرتا ہے۔ اس بے حیا جانور کے گوشت نے آپ کو ایک بے حیا قوم بنا دیا ہے۔ اتنی احتیاطی تدابیر اختیار کرنے والی قوم کے ایک فرد کو میں نے خود انہی آنکھوں سے کموڈ میں ہاتھ ڈال کر اس کو ٹھیک کرنے کے بعد بغیر ہاتھ دھوئے انہی ہاتھوں سے کھاتے دیکھا (آپ کو پڑھ کر ابکائی آئی ہوگی) کتے کا چاٹا ہوا خود چاٹتے ہو۔ آئس کریم لے کر پہلے کتے کو کھلاتے ہو اور پھر خود چاٹتے ہو۔ کتے کے منہ پر چومتے ہو اور خود کو صفائی پسند کہتے ہو۔ شراب پیتے ہو۔ شراب جیسی بُری چیز کوئی اور بھی ہوگی جو نہ صرف عقل و خرد بلکہ جسم و جان کی دشمن ہے، معدہ، جگر، دل ہر عضوِ بدن پر بہت بُرے اثرات چھوڑتی ہے۔ ڈاکٹر جتنا لکھیں منع کریں مگر تم لوگوں کی زندگی کا لازمی جز ہے۔

پانچویں بات یہ کہ تمہاری نوجوان نسل ایک طرح سے حق پر ہے کہ وہ تمہیں بڑھاپے میں اولڈ ہومز کے سپرد کر دیتی ہے کیونکہ تم لوگ عین نوجوانی میں 18 سال کی عمر میں اولاد کو گھر سے نکال دیتے ہو۔ نہ گھر نہ کوئی سہارا، نہ رہائش کی جگہ۔ بھٹک بھٹک کر کہیں نہ کہیں اپنی جگہ بنا ہی لیتے ہیں اور اس عرصے میں وہ جس گند سے گزریں تمہیں پروا نہیں ہوتی۔ اور تو اور لڑکیوں کو بھی بیک جنبش نکال باہر کرتے ہو، کوئی عزت کی پاسداری نہیں۔ تو ایسے بچے بڑھاپے میں تمہارا سہارا کیسے بن سکتے ہیں۔ میں نے سڑک پر سے گزرتے ہوئے رونے اور کرلانے کی آوازیں سنیں۔ خلافِ واقعہ ایک بلڈنگ

کے چہار طرف باڑ کی دیوار بنی ہوئی تھی، جبکہ امریکہ وغیرہ میں قانوناً باہر کی دیوار نہیں بنائی جاتی اور وہاں سے جھانکنا بھی خلاف قانون نہیں۔ میں نے اس طرح باڑ کے ساتھ چلنا شروع کیا کہ اندر جھانک سکوں۔ انتہائی ضعیف ،لاغر،محتاج بوڑھے لوگ درد سے کرلا رہے تھے۔ نرسز وغیرہ اپنی ڈیوٹی دے رہے تھے مگر ہمدردی کا کوئی بول ان کے لئے نہیں تھا جبکہ کچھ لوگ بچوں کی طرح کرلا رہے تھے۔ اسے میں نے بتایا کہ ہمارے ہاں بزرگوں کی کس قدر تعظیم ہوتی ہے۔ محبت کے ساتھ خدمت کی جاتی ہے۔(مگر افسوس اب ہم انہی کی اقدار ان سے لے رہے ہیں) کیونکہ نوجوانی میں ہماری نسل کو بھی کتنی حفاظت ملتی ہے۔تن من دھن کی قربانی دے کر ان کی حفاظت اور خدمت کی جاتی ہے۔

چھٹی وجہ یہ ہے کہ اس قدر خوشحالی اور ترقی کے باوجود یہاں غربا کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ دورانِ سفر یہ بات بھی میرے دیکھنے میں آئی کہ ایک شخص نے کتے کو بچوں کے Pram میں بٹھایا ہوا تھا۔اور وہ ظاہر کررہا تھا کہ وہ کتے کے لئے Garbage میں سے بچی ہوئی خوراک نکال نکال کر اکٹھا کر رہا ہے۔ ہمارے ہاں اگرچہ غربت بے حدوحساب ہے مگر صدقہ وخیرات کا بہت رواج ہے خصوصاً کھانا کھلانے کا۔ہاں تم لوگوں کا اصول یہ ہے کہ جب کسی کریہہ منظر کو دیکھو تو آنکھیں بند کرلو، اس کی طرف دیکھو نہیں ورنہ وہ تمہارا گریبان بھی پکڑ سکتا ہے۔ نیویارک سٹیشن پر موٹی موٹی توندوں والے شراب میں دھت ایسے لوگوں کو غور سے مت دیکھو جبکہ وہ اپنے ہی پیشاب میں لت پت ہوتے ہیں۔

میں نے کہا کہ میں برقعے میں ہوں اور تم لوگ برقع کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔تم کیا جانو کہ برقع ہمیں اللہ کے حکم سے کتنی برائیوں سے بچاتا ہے۔ ہماری طرف کوئی نگاہ بھی نہیں اٹھاتا (یہ 1982ء کی بات ہے) جبکہ آپ کے ہاں سور کا گوشت کھا کر نشے میں دھت سگے نانا یا دادا موقع ملتے ہی اپنی نابالغ نوجوان عریاں بچیوں کو بھنبھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔

وہ خاموشی سے سنتی رہی اور بعد میں بڑے تحمل سے کہا ''تم سو فیصد ٹھیک کہتی ہو۔تمہاری ہر بات سچ ہے مگر یہ نوجوان نسل ہمارے اختیار میں نہیں۔''

میں نے کہا ''معاف کرنا جیسے ماں باپ ہونگے ویسی ہی اولاد۔ کیا میری بچیاں پردے کا انکار کرسکتی ہیں جبکہ مجھے اتنا پردہ کرتے ہوئے دیکھتی ہیں؟ اور تمہاری بچیاں تمہارے لباس سے ہٹ کر پردہ کیسے اختیار کرسکتی ہیں؟''

اس واقعہ کو عرصہ تیس سال گزر چکا ہے۔ زیب داستان کے لئے ضرور کچھ بڑھایا ہوگا۔مگر میں نے تقریباً ایسی ہی باتیں کہیں۔آج ہمارے ملک کے

حالات گواہی دے رہے ہیں کہ ایسی عریانی کا نتیجہ ذلت ورسوائی اور جرائم میں اضافہ ہی ہے۔مزید کچھ اور باتیں بھی تھیں۔

چلتے چلتے ایک مزے کا واقعہ سن لیں۔ہم جب نیویارک پہنچے تو ہمارے پاس شاپنگ کے لئے صرف ایک ہی دن تھااور ہمیں صرف اوورکوٹ لینا تھا جو پہلے نہیں لیا تھا کہ اٹھائے گا کون۔ بہرحال ایک بڑے سٹور میں گھس گئے مالک سٹوراوراس کی بیوی آؤ بھگت کے لئے تیار۔کوٹ دیکھنے کے دوران میرے میاں نے ایک دم سٹور کے مالک سے پوچھا ''کیا آپ یہودی ہیں؟''اس نے حیرت سے دیکھا اور پوچھا'' آپ نے کیسے پہچانا؟''انہوں نے جواب دیا ''کیا ہم 1400 سال سے ایک دوسرے کو نہیں پہچانتے؟''اس پر وہ بے حد محظوظ ہوا، اس کی بیوی گھنٹوں ہنستی رہی اور کہتی رہی، ہم واقعی ایک دوسرے کو1400 سال سے جانتے ہیں۔

☆☆☆

آخری فیصلہ

انسانی نسل کی کہانی بھی کھیت میں لگائی جانے والی اجناس کی فصلوں سے ملتی جلتی ہے۔ان فصلوں کو کاشت کرنے کے بعد ان کی خوب دیکھ بھال کی جاتی ہے تا کہ وہ بھرپور پیداوار دینے کے قابل ہو جائیں۔معینہ مدت کے بعد ان سے اجناس حاصل کر کے پودوں کو تلف کر دیا جاتا ہے اور پھر مزید اجناس کے حصول کے لیے کھیت میں پرانی تلف شدہ اور بے نام ونشاں فصل کی جگہ پر نئی فصل لہلہانے لگتی ہے۔اسی طرح ایک نسلِ انسانی عدم سے وجود میں آ کر ایک مقررہ مدت کے لیے سطح زمین پر قیام کرتی ہے اور اپنی کارکردگی دکھا کر معدوم ہو جاتی ہے اور نئی نسل اس کی جگہ لے کر مصروف کار ہو جاتی ہے۔

انسانی شخصیت دو حصوں پر مشتمل ہے۔ایک نظر آنے والا جسمانی وجود ہے اور دوسرا پوشیدہ باطنی یا روحانی وجود۔ اگر ان دونوں حصوں میں توازن برقرار رہے تو بہترین ثمر بار شخصیت تشکیل پاتی ہے ورنہ عدم توازن کی صورت میں فرد اور معاشرے پر تباہ کن منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

ہمارے جسمانی اور روحانی وجود کا آپس میں خانہ او رچراغِ خانہ کا سا تعلق ہے جیسے اگر ایک تاریک گھر میں چراغ روشن ہو تو اس کی وجہ سے گھر میں رکھی گئی ہر چیز واضح طور پر نظر آئے گی اور بوقت ضرورت اسے بہ سہولت استعمال کر کے فائدہ حاصل کیا جا سکے گا لیکن اس کے برعکس اگر چراغ بجھ جائے گا تو اندھیرا چھا جانے کی وجہ سے ہر چیز نظر سے اوجھل ہو جائے گی اور مکین کے لئے اندھیرے میں ٹھوکریں کھانے کا امکان بڑھ جائے گا۔ یعنی مکین کے فائدے اور سہولت کیلئے روشنی کا برقرار رہنا ضروری ہے۔لیکن لگاتار روشنی کی ضمانت صرف ایندھن کی مسلسل ترسیل کے ساتھ منسلک ہے اور اگر ایندھن کی فراہمی کیلئے کاوش کی جائے گی تو ہی اس کا حصول ممکن ہوگا اور پھر ایندھن کو چراغ کے وضع کردہ حصے میں بتلائے گئے طریقے کے مطابق ڈالا جائے گا تو ہی روشنی سے فائدہ اٹھایا جا سکے گا۔ بعینہٖ اچھے اعمال اور مثبت خیالات بطور ایندھن ہمارے روحانی وجود کو جلا بخشتے اور اسے منور و مطہر کرتے ہیں۔مسلسل عمل اور یکسوئی کی بدولت روشنی کی اس لو کا دائرہ جوں جوں پھیلتا چلا جاتا ہے،توں توں یہ ہمارے وجود سے پھوٹ کر آس پاس کے ماحول میں پھیل کر اسے بھی روشن کرتی چلی جاتی ہے۔اس کے برعکس برے خیالات و اعمال سے یہ روشنی ماند پڑتے پڑتے بالآخر گل ہو جاتی ہے اور ہمارا وجود پستی اور تاریکی میں ڈوبتا چلا جاتا ہے۔

گویا مکان خواہ کیسا ہی آراستہ کیوں نہ ہو، روشنی کے بغیر بیکار ہے۔لیکن روشنی کسی محل میں پھیلے، یا کسی معمولی گھر میں جلوہ آراء ہو یا کسی جھونپڑے کو بعقہِ نور بنا دے، اس کے دم قدم سے مکان کی قدر ومنزلت، اہمیت اور افادیت بڑھ جاتی ہے۔ یعنی ہمارا مطلوب ومقصود صرف خانہ نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ چراغ خانہ بھی ہونا چاہیے۔ گویا ہمارے لیے جسمانی وجود اہم لیکن روحانی وجود بدرجۂ اولیٰ اہم تر ہونا چاہیے۔ ہماری زیادہ تر کاوشیں اس خاکی جسم کے فانی گھروندے کے اندر ملفوف لافانی روشنی کو اجاگر کرنے، اسے جلا بخشنے اور پھیلانے کے لئے صرف ہونی چاہئیں کہ ہمارے جسم کی حیثیت صدف کی سی ہے اور روحانی وجود کی سچے موتی کی سی۔ لیکن مقابلتاً صدف اہم ہے اور موتی اہم ترین۔

ہمارے لیے آنکھیں بے حد اہم ہیں لیکن آنکھیں بصیرت اور بصارت سے محروم ہوجائیں تو ان کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔

رات کے اندھیرے کی سیاہ چادر کو تار تار کرنے کے لئے چاند کا وجود موجود ہے لیکن اصل چیز اس کی چاندنی ہے۔ اسی طرح دن کے اوقات میں اجالا پھیلانے کے لئے سورج کا وجود بے حد ضروری لیکن اصل چیز اس کی روشنی ہے۔

کسی ادارے میں کام کرنے والے افراد کی صرف جسمانی دلکشی اور جامہ زیبی ہی ادارے کے لئے سرمایۂ افتخار نہیں ہوتی بلکہ اسکی ساکھ کارکنوں کی کارکردگی سے بنتی ہے۔ گویا ادارے کے لئے کارکن بہت اہم ہیں لیکن اصل چیز ان کی کارکردگی ہے۔

پھل حاصل کرنے کے لئے درخت کا وجود بہت ضروری ہے لیکن پھلدار پودے کا اصل جوہر اس کا پھل ہے۔ اسی طرح پھولدار پودے کا اصل جوہر اس کا پھول ہے۔ ان درختوں اور پودوں کی نگہداشت اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر کی جاتی ہے کہ ان سے پھل اور پھول حاصل کیے جائیں۔ انسانی شخصیت کی اٹھان اور نشوونما بھی اس انداز سے کرنی چاہیے کہ اس کی باطنی خصوصیات وکمالات بارآور ہوکر پھل اور پھول آور ہوجائیں۔

ہم اپنی روزمرہ زندگی میں جن کاموں کو سرانجام دیتے چلے جاتے ہیں، ان کے مثبت اثرات براہِ راست ہماری شخصیت کے انہی دو پہلوؤں پر پڑتے چلے جاتے ہیں اور ہمارے منتخب کردہ اعمال واشغال کی وجہ سے گھٹتے بڑھتے چاند کی طرح کبھی ہماری شخصیت کا کوئی پہلو نمایاں ہوکر سامنے آجاتا ہے تو کبھی کوئی۔

ہمارا جسمانی وجود چند مخصوص امور کی انجام دہی سے لذت حاصل کرتا ہے جبکہ روحانی وجود بھی چند خاص اشغال واعمال کی وجہ سے تسکین پاتا ہے۔ مثلاً کسرت سے جسمانی وجود خوبصورت اور توانا ہوجاتا ہے۔ اچھی خوراک جسمانی نشوونما اور طاقت کا باعث بنتی ہے۔ گہری اور پرسکون نیند کا تعلق بھی اچھی صحت سے ہے۔

برتری کا احساس، لذیذ اورمرغن، تفاخر کی باعث بننے والے اطلس وحریر کے قیمتی ملبوسات، آرائش ونمائش کا سامان اورانا کوتسکین بہم پہنچانے سے جسمانی وجودلطف اندوز ہوتا ہے۔لیکن لذت وسرور کا یہ احساس صرف چند عارضی لمحات پرمحیط ہوتا ہے۔اس کے برعکس ہمارا روحانی وجودایثار، اخلاص، ہمدردی، خیرخواہی، عبادت، ریاضت اور اطاعت سے تسکین پاتا ہے اوراس کے نتیجے میں اک عجیب سرشاری کی سی کیفیت تادیر قلب ونظر کو گرمائے رکھتی ہے۔

روحانی وجود کی سرشاری، جسمانی وجود پرمثبت اثرات ثبت کیے رکھتی ہے لیکن جسمانی وجود کی لذت ہمارے روحانی وجود پرمنفی اثرات مرتب کرتی ہے۔

ہماری ذات کے ان دونوں پہلوؤں کی دیکھ بھال، نشوونما اورنگہبانی کے لیے وقت کا ایک مخصوص پیمانہ مقرر کردیا گیا ہے۔وقت کی اس مقدار کوکوئی کم کرسکتا ہے اور نہ کوئی بڑھا سکتا ہے۔یعنی ہم اپنے دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں سے کسی کو کچھ گھنٹے مستعار نہیں دے سکتے اور نہ ہی کوئی شخص کہیں سے کسی بھی قیمت پراضافی وقت خرید سکتا ہے۔اب یہ ہر شخص پرمنحصر ہے کہ وہ مقررکردہ محدود وقت کو اپنی شخصیت کے کس پہلو کی تعلیم وتربیت کے لئے کیسے استعمال کرتا ہے۔

وقت کی مثال بہتے ہوئے چشمے کے پانی کی سی ہے کہ جو پانی ایک دفعہ دھارے کی گردش کا حصہ بن کراس میں سے بہہ نکلتا ہے، وہ دوبارہ پلٹ کر کبھی دھارے میں شامل نہیں ہوتا ہر شخص بقدرِ ہمت وشوق اپنے اپنے ظرف کے برتنوں میں اس چشمے سے پانی حاصل کرلیتا ہے۔اگر کسی کے برتن صاف ستھرے ہوں گے تو وہ گویا پاکیزہ، اجلا اور مصفا پانی لے کرلوٹے گا لیکن اگر کسی کے برتن میلے کچیلے ہوں گے تو وہ اپنے لیے گدلا، تعفن زدہ اور بے ثمر پانی جمع کرے گا، جواس کے روحانی وجود کونقصان پہنچا کراسے کمزور کردے گا۔

وقت کا پانی سب کے لئے یکساں رفتار کے ساتھ رواں دواں ہے۔سب کے لئے اس پانی کی یکساں مساوی تقسیم جاری وساری ہے لیکن سب کا اپنا اپنا ظرف ہے، اپنا انتخاب ہے، ہرفرد کی ذاتی خواہش ہے، انفرادی کاوش ہے، نفسی پسند ہے، اپنا شوق ہے، ذاتی کارکردگی ہے، انفرادی عمل ہے، اپنا منتخب کردہ شغل ہے اوراپنا فیصلہ ہے کہ وہ اس پانی کا مصرف کیسے کرتے ہیں۔آج کا بروقت اور دانشمندانہ فیصلہ ہمیں اوجِ ثریا تک لے جاسکتا ہے اورآج کا اٹھایا ہوغلط قدم ہمیں اتھاہ پستیوں میں گرا سکتا ہے۔اس فیصلے کا اختیار ہمیں صرف آج کے لئے دیا گیا ہے۔کل یہ اختیار ہم سے چھین لیا جائے گا۔ اور پھراس دنیا میں ہمارے کیے گئے تمام تر فیصلوں کی روشنی میں ہم پر رب کائنات کا حتمی، اٹل اورآخری فیصلہ نافذ ہوجائے گا۔یعنی کل کا فیصلہ آج کی بنیاد پر ہوگا۔

☆☆☆

مہر ماہ سلطان

مہر ماہ سلطان ۲۱ مارچ ۱۵۲۲ء کو ترکی کے شہر استنبول میں پیدا ہوئی اور ۲۵ جنوری ۱۵۷۸ء کو وفات پائی۔ یہ سلطنت عثمانیہ کے دسویں فرمانروا سلطان سلیمان اول ذی شان کی بیٹی تھی۔ اس کی ماں کا نام حورم سلطان تھا جو بادشاہ کی منظور نظر کنیز تھی۔ بعدازاں بادشاہ نے اس سے شادی کر لی تھی۔ سلطان سلیمان کے چار بیویوں سے چودہ بچے پیدا ہوئے جن میں سے چھ بچوں کا ذکر تاریخ میں ملتا ہے جو پروان چڑھے ان چھ میں مہر ماہ، سلیمان کی اکلوتی بیٹی تھی۔

مہر ماہ کے معنی ہیں سورج اور چاند۔ کچھ مورخین نے اس کے نام کے معنی ملائمت، بردبادی، رحم دلی، پیار محبت، الفت اور چاہ وغیرہ تحریر کیے ہیں۔

سلطان سلیمان نے اپنی بیٹی کی تعلیم وتربیت پر خصوصی توجہ دی تھی۔ مہر ماہ نہایت باحمیت، دیندار اور مخیّر خاتون تھی۔ اس نے رفاہِ عامہ کیلئے بہت سے کام کیے۔ جہاد میں بھی حصہ لیا اور نہایت شاندار تاریخی مساجد بھی بنوائیں۔ اس نے اپنی بے شمار دولت دینی اوقاف کے لئے وقف کر دی۔ ان اوقاف میں سب سے اہم اس کی تعمیر کروائی ہوئی دو مسجدیں ہیں۔ ایک شہر سقوطری یا اشقودرہ (Scutri) کے گھاٹ کے قریب اور دوسری استنبول قسطنطیہ میں بابِ اورنہ کے قریب ہے۔ یہ مسجدیں اسی کے نام سے مشہور ہوئیں۔ اول الذکر مسجد اس دور کے نامور معمار سنان پاشا کے کمالِ فن نے مسجد کے ساتھ ایک کمپلیکس بھی بنوایا جس میں مدارس، پرائمری سکول، دماغی امراض کا ہسپتال اور دیگر عمارتیں بنائی گئیں جن میں سے آخری دو عمارتیں منہدم ہو چکی ہیں۔ اس کمپلیکس کے نزدیک مہر ماہ نے اپنے رہنے کیلئے ایک محل بنوایا۔ محل میں حمام اور فوارے بھی بنائے گئے۔ اس نے نہر زبیدہ کی تعمیر نو بھی کروائی۔ اس نہر کی مکہ شہر کے اندر توسیع کروائی گئی۔ اس نے اپنی والدہ حورم سلطان کا شاندار مقبرہ بھی تعمیر کروایا۔

مہر ماہ سلطان اپنے اثر ورسوخ اور قوت کی وجہ سے سلطنت عثمانیہ کی سب سے طاقتور شہزادی کے طور پر مانی جاتی ہے۔ سلطان سلیمان اپنی بیٹی کو نہایت عزت واحترام دیتا اور اس کی ہر خواہش پوری کرتا۔ شہزادی نے حکومت کرنے کے تمام اوصاف اپنے والد سے ورثے میں پائے تھے۔ سترہ سال کی عمر میں اس کی شادی رستم پاشا سے ہوگئی جو بعد میں سلیمان کا سب سے بڑا وزیر بنا۔

سلطان سلیمان اپنے والد خلیفہ سلیم اوّل کی وفات

کے بعد تختِ سلطنت پر بیٹھا۔ اس کی خلافت کا آغاز ۱۵۲۰ء میں ہوا۔اس نے سینتالیس برس حکومت کی اور یہ عثمانی سلاطین میں سب سے لمبا عرصہ حکومت تھا۔ وہ سلطنتِ عثمانیہ کا دسواں اور سب سے بڑا فرماں روا تھا۔ بعض مورخین نے اسے سلیمانِ اعظم لکھا ہے۔ مغربی مورخین اسے سلیمان ذی شان لکھتے ہیں۔ ترک اسے سلطان سلیمان قانونی کہتے ہیں۔ اس نے نظام حکومت چلانے کیلئے جو قوانین بنائے ان کی بناء پر اس کا شمار دنیا کے بڑے بڑے قانون سازوں میں ہوتا ہے۔ ملّا ابراہیم جلیبی نے اس کے بنائے ہوئے قوانین کو کتابی صورت دے دی تھی۔ ان قوانین پر عثمانی فرمانروا ایک لمبے عرصے تک عمل کرتے رہے۔

خلیفہ سلیمان کا عہد، سلطنت عثمانیہ کا سنہری دور تھا۔خواہ جہادی کاروائیوں سے دیکھا جائے یا تعمیراتی، علمی وادبی اور عسکری پہلوؤں سے، اس کا عہد عثمانی سلطنت کا نقطۂ عروج تھا۔ یہ سلطان یورپی سیاست میں بے پناہ اثر ورسوخ رکھتا تھا کیونکہ وہ اپنے عہد کی سب سے بڑی قوت تھا۔ اس کے عہد میں سلطنت عثمانیہ میں خوشحالی اور امن وسکون کا دور دورہ تھا۔

سلطان سلیمان نہایت دانش مند، جوانمرد، شجاع، فیاض اور باوقار حکمران تھا۔ وہ ملک کا نظم ونسق قائم رکھنے اور سلطنت کے انتظام، آئین اور قواعد مرتب کرنے میں غیر معمولی مہارت رکھتا تھا۔ اس لیے بھی اسے سلطان سلیمان قانونی کہا جاتا تھا۔

وہ بہت بڑا فاتح تھا۔ اس نے بلگریڈ، روڈس، ہنگری، جزیرہ نمائے کریمیا، موصل، بغداد، بصرہ، عدن، طرابلس اور الجزائر کے علاوہ شمالی افریقہ کے بڑے علاقے کو زیرنگیں کرلیا۔ مصر کی حکومت کو وسعت دے کر سوڈان تک پہنچا دیا اور آسٹریا کو خراج دینے پر مجبور کردیا۔ اس کے عہد میں ترکوں کی بحری قوت کو بھی بڑا عروج نصیب ہوا اور وہ سارے بحیرہ روم، بحیرہ قلزم، بحیرہ عرب اور بحرہند پر چھا گئے۔

امیرالبحر باربروسہ سلطان سلیمان کی بحری فوج کا سالار اعظم تھا۔ اس کے بارے میں مورخین لکھتے ہیں کہ مشہور جہاز ران خیرالدین اور اس کا بھائی باربروسہ جزیرہ متلّین کے عیسائی تھے۔ وہ دونوں سمندری ڈاکو تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں ہدایت دی اور دونوں مشرف بہ اسلام ہوئے، مسلمان ہوکر انہوں نے سلطان تیونس کی ملازمت اختیار کرلی اور ہسپانوی اور پرتگالی جنگی جہازوں سے معرکہ آرائی کرنے لگے۔ ان دونوں بھائیوں نے سلطان سلیمان کے والد سلطان سلیم کو ایک جنگی جہاز تحفے میں بھیجا جو ایک معرکے میں انہوں نے عیسائیوں سے چھینا تھا۔ سلطان نے جہاز کا تحفہ قبول کرلیا اور دونوں بھائیوں کو عطیات سے نوازا جس سے ان کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ جب سلطان سلیمان مصر پہنچا تو ان دونوں بھائیوں نے اس کی خدمت میں قاصد بھیج

کر سلطنت عثمانیہ سے اپنی وفاداری کا اعلان کیا۔ باربروسہ نے ہسپانیہ کے ستر ہزار مظلوم مسلمانوں کو اپنے جہازوں میں لاد لاد کر الجزائر پہنچایا۔ سلطان سلیمان نے اسے عثمانی بحریہ کا امیر اعظم منتخب کر لیا۔

باربروسہ نے یورپ کی کئی حکومتوں کو بحری لڑائی میں شکست دی۔ اس زمانے میں ہسپانیہ کو دنیا کی سب سے بڑی بحری طاقت سمجھا جاتا تھا۔ وینس کا ملک بھی بحری قوت کے لحاظ سے بڑی شہرت اور بحری طاقت گردانا جاتا تھا۔ ۱۵۳۸ء میں پری ویسا کے مقام پر ہسپانیہ اور وینس کے متحدہ جنگی بیڑے کا ترکوں کے جنگی بیڑے سے مقابلہ ہوا۔ یورپ نے بھی ہسپانیہ کی مدد کیلئے جنگی جہاز بھیجے لیکن امیر البحر خیر الدین باربروسہ نے اس معرکے میں دشمن کے متحدہ جنگی بیڑی کو ایسی کمر توڑ شکست دی کہ وہ مدتوں اپنے زخم چاٹتا رہا۔

سلطان سلیمان کے دور میں نہ صرف بے شمار فتوحات ہوئیں بلکہ اس کے دور میں رعایا نہایت آسودہ اور خوش حال ہوگئی۔ اس نے اپنی وسیع سلطنت کا انتظام نہایت خوش اسلوبی سے چلایا۔ آج بھی ترک تاریخ میں اس کا نام نہایت عزت واحترام سے سنہری حروف میں لکھا جاتا ہے اس نے ۹۷۶ھ/۱۵۶۶ء میں وفات پائی۔

رستم پاشا سے شادی کے بعد مہر ماہ سلطان کے دو بیٹے جہانگیر اور بایزید اور ایک بیٹی عائشہ خانم پیدا ہوئے۔ بیٹوں کے ختنہ کی تقریب اس نے اس شان سے کی کہ وہ ایک تاریخی واقعہ بن گیا۔ اس نے اپنی بیٹی کی شادی وزیر اعظم احمد پاشا سے کی۔ رستم پاشا نے ۱۵۶۱ء میں وفات پائی۔

شوہر کی وفات کے بعد اس نے امور سلطنت میں دلچسپی لینا شروع کر دی اور اپنے والد سلطان سلیمان کو مالٹا پر حملہ کرنے کی ترغیب دلائی۔ اس ترغیب کا مقصد جہاد میں حصہ لینا تھا۔ اس نے اپنے والد کو چار سو جنگی کشتیاں اپنے خرچ پر بنوانے کی پیش کش کی۔ امورِ سلطنت میں وہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی۔ اسی سلسلے میں اس نے پولینڈ کے بادشاہ کو ایک خط بھی لکھا، جو تاریخ کا حصہ ہے۔

وہ نہایت سمجھدار اور دانا خاتون تھی۔ باپ کی وفات کے بعد اس نے اپنے باپ کے جانشین شہزادہ سلیم کو پچاس ہزار طلائی اشرفیاں بھجوائیں تا کہ اس کے کام آسکیں۔ شہزادہ سلیم سلطنت کے بہت سے امور میں اس کے مشوروں کا طلب گار رہتا۔

شہزادی مہر ماہ سلطان نے ۵۵ سال کی عمر پائی۔

(استفادہ: چار سو باکمال خواتین از طالب ہاشمی، اٹلس فتوحاتِ اسلامیہ از احمد عادل کمال (ترجمہ محسن فارانی)، انٹرنیٹ)

☆☆☆

جدائی

پہلے تو یہاں آبادی کا نام ونشان نہ تھا۔ اس راہگزر پہ جاتے ہوئے خوف کا سا گماں ہوتا، مگر پھر شہر کی وسعتیں بڑھتی گئیں اوراب تین اطراف لوگوں نے رہائش اختیار کرلی ہے پھر بھی اسے شہر خموشاں ہی پکارتے ہیں۔ یہاں داخل ہوں تو ہر طرف اداسی سراٹھائے کھڑی ہے، کچھ جنگلی جھاڑیاں جہاں جگہ ملی اُگ آئی ہیں۔ ان میں اکثر خاردار ہیں جو اپنے پیاروں کی قبور تک جانے والوں کے دامن کو الجھا لیتی ہیں۔ شام کے وقت یہاں کا ماحول نہایت اداس وخاموش ہوکر ہیبت ناک ہوجاتا ہے۔لوگ کسی مجبوری ہی سے ایمرجنسی لائٹوں کے ہمراہ کسی توشۂ خاک کو پیوندِ خاک کرنے آتے ہیں۔ ہاں! ماہِ شعبان کی پندرھویں شب بڑی بارونق ہوتی ہے۔کچھ عرصے سے یہ رونق اتنی ہونے لگی کہ کسی میلے کا گماں ہوتا ہے۔اس موقع پر لوگ اپنے پیاروں کو یاد کرنے کم، رسم وروایت کی پاسداری میں کچھ زیادہ ہی آجاتے ہیں۔ چند منچلے پٹاخے چھوڑ نے تک سے باز نہیں آتے ۔ہاں! مگر اکثریت اپنے پیاروں کی قبور پر اگربتی اورموم بتیاں روشن کرتی ہے، اظہار عقیدت کے طور پر پھولوں کی پتیاں بھی نچھاور کی جاتی ہیں مگر پھر کوئی ادھر کا شاید ہی رخ کرتا ہو۔

ایک روز شام ڈھلے میں اس ویران بستی کی جانب رواں دواں تھا، اندھیرا بڑھتا جاتا تھا، سناٹا ماحول میں گہرا سکوت برپا کرچکا تھا۔ میں محبت کے اس پیکر کو عقیدت پیش کرنے کے لئے اس منڈیر پر آبیٹھا جو دیگر اہلِ خانہ کی قبور کے گرد بنائی گئی تھی۔ ہر طرف گہرا سکوت، کہیں کہیں کسی پرندے کی آواز سنائی دیتی جو اس کی خوش گلوئی کے بجائے کراہنے کی معلوم ہوتی۔قبریں کچی تھیں جابجا جنگلی جھاڑیاں آسمان کی طرف اس طرح بلند ہوئی تھیں کہ جیسے انگلیاں چمکتے ہوئے چاند ستاروں کو درسِ خاموشی دے رہی ہوں۔ بے شک انسان زندگی کو حیرت اورتعجب سے دیکھتا اور برتتا ہے۔نہیں جانتا کہ یہ کائنات تو عبرت کی جا ہے۔ یہاں کسی کو ثبات نہیں، جو آیا ہے اسے لوٹ کر جانا ہے اور پھر ایک دن فنا تمام شُد کے ذریعے خاتمہ یقینی ہے۔

یہ حسرتوں، آرزوؤں اورارمانوں کی ایک ایسی خوابگاہ ہے جہاں ہر ایک کو آنا ہے۔ میں دیر تک سر جھکائے بیٹھا اس ہستی کے تخیل میں کھویا رہا جس کے ساتھ میرا بچپن، لڑکپن اور جوانی بھی دفن ہوچکی ہے۔ میری وہ شوخ وچنچل حرکات جواس ہستی کی خوشیوں کو

دوبالا کرتی ہوں گی اب میری یادوں کے نہاں خانے میں گم گشتہ کشتی کی طرح ہچکولے لے رہی ہے۔ زندگی کے وہ خوشگوار لمحے اب تصور کے سہارے جاگتے ہیں مگر انہیں جلا بخشنے والی میری ماں منوں مٹی تلے دنیا و مافیہا سے بے خبر سو رہی ہے۔ وہ خود تو یہاں نہیں آئی اس کے بطن سے متولد ہونے والوں کے کاندھوں نے یہاں تک کا فاصلہ طے کیا اور پھر یہی اس کے جگر گوشے اسے اندھیری قبر میں لٹا کر اوپر سے ڈھک کر مٹی ڈال کر رخصت ہو گئے تھے۔

میری ماں ۱۴ رمضان المبارک بمطابق ۲۷ ستمبر ۲۰۰۷ء کو اس وقت ہم سے جدا ہوئیں جب لوگ سحری کھا کر منجھلے روزے کی تیاری کر رہے تھے۔ چودھویں روزے کا منجھلا روزہ ہونا کبھی میری سمجھ میں نہیں آیا کیونکہ میں تو یہی سمجھ پایا کہ منجھلا بیچ والے کو کہتے ہیں اور ہر اعتبار سے پندرھواں روزہ ہی منجھلا ہونا چاہیے مگر سیدھے سادے اور دیہاتی ماحول میں پرورش پانے والی میری سادہ لوح ماں ہمیشہ یہی کہتی رہیں کہ چودھواں روزہ ہی منجھلا روزہ ہے۔ جب فرشتۂ اجل نے اپنا کام پورا کیا تو مجھے یقین ہو گیا کہ وہ درست ہی کہتی تھیں۔ ایک مسلمان کی دنیوی اور اخروی ہر دو کا درمیان میری ماں کے اعتبار سے چودھواں یعنی منجھلا روزہ ہی تو ہے، وہ سفرِ حیات مکمل کر کے اس سفر پر روانہ ہوئیں جہاں کی زندگی لامتناہی ہے اور وہاں تو اللہ نے اپنے نیک بندوں کے لئے فردوس سجائی ہے جو اس کی رحمت اور فضل و کرم کے طفیل ہر مومن کو ملنے والی ہے۔

کئی پرندے ایک ساتھ چلائے، یہاں کے ماحول میں خوف کی کیفیت در آئی۔ اس ملگجی اندھیرے میں کون تھا جو ان پرندوں کے آرام میں مخل ہو کر انہیں سوتے سے جگا گیا۔ پھر کئی جانب سے پنچھیوں کی آوازیں کراہنے لگیں۔ میں چونک کر ماں کی قبر کو دیکھنے لگا جہاں ایمرجنسی لائٹ روشن تھی۔ شاید اسی روشنی نے یہاں کے باسیوں کے لئے غیر معمولی صورتحال پیدا کر دی تھی۔ وہ سب بظاہر اپنے گھونسلوں میں محوِ آرام تھے مگر روشنی نے ان کی نیند اجاڑ دی تھی کہ ایک منچلا بے وقت یہاں کیوں آن بیٹھا ہے، کس کی یاد اسے یہاں لے آئی ہے، اگر مر چکا ہے تو بیٹھا کیوں ہے اور زندہ ہے تو جاتا کیوں نہیں؟ میں کچھ دیر تک ان پرندوں کی آوازوں کو سنتا رہا پھر مجھے وہ احسانات یاد آئے جو اس ہستی نے مجھ پر کیے تھے اور جن کا بدلہ تنہا میں نہیں سب بہن بھائی مل کر بھی نہیں دے سکتے۔ چند ہفتوں کی بیماری اور پھر ان کی تیمارداری ابھی بیزاری میں نہ بدلی تھی کہ داعئ اجل نے آسانیاں پیدا کیں۔ غم کا ایک پہاڑ تھا جو اچانک ہم پر آن گرا مگر پھر ڈھارس بندھی، ہچکیوں اور سسکیوں کے ساتھ اداسی و خاموشی غالب رہی پھر ہم سب اپنی اپنی دنیا میں مگن ہوتے چلے گئے۔

آج مجھے اس قبر کے گرد بیٹھے وہ مناظر یاد آ رہے

ہیں کہ جب پیدائشی طور پر بصارت سے محرومی کے باوجود اس قبر میں سونے والی نے الفت ومحبت کا دامن وا کیے مجھے اپنے آنچل میں چھپا لیا۔ جب کوئی ہم عمر ساتھ نہ کھلاتا تو وہ باتیں کر کے دل بہلاتی، شام کے ایسے ہی اندھیروں میں جب راہ نہ سوجھتی اور میں ٹکرا کر گر پڑتا تو وہ دیر تک تسلیاں دیتی اور دستِ دعا بلند کیے ترقی وکامرانی کی دعائیں کرتیں۔ پھر جب اسکول جانے کی نوبت آئی تو تجھ مجھ سے مانگ کر اس نے میرے لیے فیس جمع کی۔ ہر خواہش کی تکمیل میری ضد ہوتی۔ بچپن کا چھوٹا سا ذہن ان معاشی ناآسودگیوں کو سمجھنے سے قاصر تھا جن سے وہ نبرد آزما تھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ چاند رات کو شام ہی سے میں روئے جا تا تھا اس عید پر تو جوتے ضرور لوں گا۔ انہوں نے تمام تر جمع پونجی کے آٹھ روپے نکال کر اپنے بھتیجے کو دیئے جو مجھے قریبی بازار میں ایک بڑی سجی دھجی دکان میں لے گیا۔ یہاں ہر طرف رونق تھی، بچے اور بڑے بیٹھ کر جوتے پہن رہے تھے پھر میری بھی باری آئی، جوتے پہنے ننھے ننھے قدموں سے دری پر چل کر دیکھا اور پھر مول تول کی نوبت آ گئی۔ دکاندار بارہ روپے سے کم لینے کو تیار نہ تھا۔ ہماری کل پونجی آٹھ روپے تھی۔ میرے اس کزن نے اپنی جیب سے ایک روپیہ اور نکال کر دیا مگر دکاندار نہ مانا۔ میں جوتے پہن کر اس تمام بھاؤ تاؤ سے بے نیاز خوشی سے سرشار تھا۔ جب سودا نہ بنا تو جوتے اتارنے کو کہا گیا مگر میں بھائی کا ہاتھ چھڑا کر بھاگ جانا چاہتا تھا۔ پھر میں مچلتا، روتا اور بلکتا رہا م جوتے اتار لیے گئے۔ گھر آتے آتے آنسوؤں سے دامن بھیگ چکا تھا۔ بھائی نے پیسے واپس کیے اور ماں نے مجھے سینے سے لگا کر تھپک تھپک کر سلا دیا۔

اے ماں! تُو تھی تو یہ تسلیاں دینے والی ہستی بھی تھی، آج کون میرے آنسو پونچھے گا؟ مگر اب تو تیری دعاؤں کے سہارے سب کچھ بدل چکا ہے۔ وہ جس کی خواہش تُو نے کی تھی سب کچھ مل چکا۔ شہرت، عزت، دولت گویا سب ہی کچھ ہے ہاں! مگر تُو نہیں اور وہ ضدی بچہ نہیں جو نئے جوتے پہنے بغیر عید کی خوشیوں کو ادھورا سمجھتا تھا۔

☆☆☆

آج کچھ درد میرے دل میں.....

کہتے ہیں کہ گیدڑ کی موت آئے تو شہر کا رُخ کرتا ہے۔ ہماری جو شامت آئی تو بیٹھے بٹھائے ایک کورس میں داخلہ لے لیا۔ کورس بھی کوئی سیدھا سادہ سلائی، کڑھائی یا کھانے پکانے کا نہیں، بلکہ علمِ وراثت کے اصول وقواعد کا مشکل ترین کورس۔ سوچا، اپنے حقوق سے تو واقف ہونا ہی چاہیے۔ دیکھتے ہیں ہم کس کس کے وارث ٹھہرتے ہیں اور کون کون ہماری موت کا منتظر۔

خوشی خوشی پہلے دن کلاس میں پہنچے۔ آج تعارفی لیکچر تھا۔ علم الفرائض کی ضرورت اہمیت، معانی، ترکہ کی تقسیم کا طریقہ کار۔ تھوڑی سی شُد بُد پہلے سے تھی سوزیادہ مشکل نہ لگا۔ مگر دوسرے ہی دن یوں محسوس ہوا کہ گویا اوکھلی میں سر دے دیا ہے۔ اب موسلے تو پڑنے ہی تھے۔

ہر روز پہلے لیکچر ہوتا۔ اصل، فرع، ذی الفرض، عصبہ، بنوت، خوولت، علاّتی، اخیافی، ثُلثان، سُدُس جیسے رشتے، حصے اور ورثاء کی اقسام یاد کرنی پڑتیں اور پھر کچھ اس طرح کے سوال حل کرنے پڑتے کہ میت کی بیوی، ایک بیٹی، ماں اور باپ ہیں، کس کو کتنا حصہ ملے گا؟ میت کی دو پوتیاں، ایک حقیقی بہن اور ایک علاتی بھائی ہے۔ کون وارث ہے اور کون محروم؟ اگر حقیقی بہن کی جگہ حقیقی بہن کا بیٹا ہوتا تو وراثت کیسے تقسیم ہوتی؟

کبھی میت کے ماں باپ فوت ہوتے اور ہم سے مطالبہ کیا جاتا کہ نانی اور دادی کا حصہ نکالیں۔ کبھی دھمکایا جاتا کہ سچ سچ بتاؤ اس مسئلہ میں دادا ذی الفرض ہے یا عصبہ؟ یا یہ کہ اولاد ماں باپ کے لئے حجب حرمان ہے یا حجب نقصان؟ جدّہ صحیحہ اور جدّہ فاسدہ کی بحث نے تو ہمیں کردہ ناکردہ تمام گناہ یاد کرا دیئے۔

پھر اسی پر بس نہیں، فرمائش ہوتی، مندرجہ ذیل نسب کی کون سی قسم سے تعلق رکھتے ہیں؟ کلالہ کسے کہتے ہیں؟ باپ اگر عصبہ بن رہا ہو تو ماں کا حصہ کتنا ہے؟ پوتیاں کب 1/6 لیتی ہیں اور کب 2/3؟ دو بیٹیوں، پوتی، پڑپوتے اور چچا میں ترکہ تقسیم کریں اور جب ہم محنت سے سب کے حصے نکال بیٹھتے تو پتہ چلتا کہ جسے ہم نے نہایت فراغ دلی سے وراثت میں حصہ دیا ہے، وہ سرے سے محروم ہے اور جو محروم تھا، وہ وارث بن بیٹھا ہے۔

رفتہ رفتہ اس کورس کا اثر روزمرہ کی گفتگو پر بھی پڑنے لگا۔ شادی کی ایک تقریب میں دلہن کے پاس بیٹھی بزرگ خاتون سے ہم نے نہایت احترام سے

پوچھا: ''آپ دلہن کی جدّہ صحیحہ ہیں یا فاسدہ؟''

اُن کی خشمگیں نگاہوں نے بتایا کہ ہمارے اس سوال کا کافی غلط مطلب سمجھا گیا ہے۔

ایک مہمان خاتون بڑے فخر سے بتا رہی تھیں: ''میرے چار بیٹے ہیں اور دو بیٹیاں۔ ماشاءاللہ سب ہائیلی کوالیفائیڈ ہیں۔ ایک بیٹا ڈاکٹر ہے۔ ایک انجینئر۔ ایک نے ایم بی اے کیا ہے اور ایک چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہے۔ بڑی لڑکی انگلش ایم اے ہے اور کالج میں پڑھاتی ہے اور چھوٹی لڑکی.....''

ہم نے جلدی جلدی حساب لگا کر بتایا ''آپ کے ترکے کے دس حصے بنیں گے۔ دو دو لڑکوں اور ایک ایک بیٹیوں کا۔ اور اگر تب تک آپ کے میاں بھی زندہ ہوئے تو 4/1 اُن کا۔'' ہم نے فاتحانہ نظروں سے اُن کی طرف دیکھا مگر بجائے اس کے کہ وہ ہماری اس مفت سروس کی قدر کرتیں، (جس نے انہیں ایک بڑے دردِ سر سے بچا لیا تھا) وہ منہ پھیر کر وہاں سے چل دیں۔

ایک دن جب موسم نہایت سہانا تھا۔ رم جھم ہو رہی تھی۔ سب افرادِ خانہ ٹیرس پر بیٹھے، موسم سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ایسا خوبصورت موسم ہو اور پکوڑے نہ ہوں، یہ تو ممکن نہیں۔ گرما گرم خوشبو اڑاتے پکوڑوں کی پلیٹ جب سامنے آئی تو سب ہی اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔ اس سے پہلے کہ چھینا جھپٹی ہوتی، ہم نے نہایت انصاف سے پکوڑوں کی تقسیم کرتے ہوئے کہا: ''4/1 پکوڑے بابا کے ہیں اور 8/1 میرے۔ باقی پکوڑوں کے سات حصے بنیں گے۔ ایک بہن کا اور دو بھائیوں کے۔

بھائیوں نے مسکراتے ہوئے بہن کو دیکھا۔ اس نے نہایت سنجیدگی سے دونوں ہاتھ بڑھا کر خود سارے پکوڑے قابو میں کرتے ہوئے کہا: ''یہ وہ ایک تہائی حصہ ہے جس کی آپ وصیت کریں گی۔''

اور بھائیوں کے شور مچانے کے باوجود کہ وارث کے حق میں وصیت نہیں ہوسکتی، اس نے ہمیں احساس دلا دیا کہ مرنے کے بعد والے اصول زندگی میں لاگو نہیں ہوسکتے۔ زندگی میں بچوں کے درمیان انصاف ہی کرنا پڑے گا۔

دو ہفتے کی جاں گُسل ہاتھا پائی کے بعد (جس میں دامنِ علم کم کم ہی ہمارے ہاتھ آیا) نوید سنی کہ ٹیسٹ ہوگا۔ بالآخر وہ روزِ حساب بھی آ پہنچا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ پرچہ کھولا اور سوالات پر نظر دوڑائی۔

س۱۔ خلع، فسخ نکاح اور طلاقِ رجعی کے بعد تقسیمِ میراث کا کیا حکم ہے؟

س۲۔ بھتیجے نے تایا کو گولی مار کر شدید زخمی کر دیا، تاہم تایا سے پہلے خود حادثے میں مر گیا۔ ان دونوں میں توارث کا کیا حکم ہے؟

س۳۔ ورثاء میں پوتی، اخیافی بھائی، علاتی بہن کا

پوتا اور علاتی چچا کا بیٹا، ترکہ تقسیم کریں۔

بہرحال پرچہ دے آئے ہیں۔ بچے شدت سے منتظر ہیں کہ دیکھیں اماں کا کیا رزلٹ آتا ہے۔ ہمیں تو بڑی دھمکیاں دیتی ہیں کہ ''اتنے پرسنٹ نمبر ہوں۔ خبردار جو دسویں نمبر سے نیچے آئے۔''

خیر، اللہ عزت رکھنے والا ہے۔ دعا کر رہے ہیں کہ بچوں کے سامنے ناک اونچی رہے۔ فی الوقت تو یہ حال ہے کہ صبح جب آنکھ کھلتی ہے تو منہ سے کلمہ کی بجائے کلمات نکلتے ہیں۔

''علاتی بہن کے پوتے کا بھتیجا، حقیقی چچا کی بیٹی کی نواسی، پردادا کے بھائی کے بیٹے کا پوتا۔''

دیکھئے کہ کب تک اس مرض سے آرام آتا ہے، ویسے کہتے ہیں کہ خود کردہ را علاج نیست۔

خوب تھا، پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ
کہ بھلا چاہتے ہیں اور برا ہوتا ہے
رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

☆☆☆

بتول میگزین

مائے نی میں کنوں آکھاں؟

(ساجدہ رفیق۔کراچی)

کبھی کسی نے ماں کا دل چیر کر دیکھا ہے؟ ارے ماں کا دل چیرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ ماں کے تو چہرے پر ، اسکی آنکھوں میں دل کا حال صاف نظر آتا ہے۔ اچھا تو بتائیں کبھی کسی ایسی ماں کا چہرہ دیکھا ہے جس کے تین جگر گوشے زخموں سے چُور لہو لہان پڑے ہوں؟ وہ ماں کس کی طرف دیکھے، کس کے زخموں پر پھاہے لگائے، کس کی چیخوں پر اپنے کان بند کرے اور کس کو کیسے دلاسہ دے۔ وہ کس آزمائش سے گزرتی ہے، کون سی سولی پر ٹنگی ہوتی ہے۔ اس کی جان حلق میں اٹک جاتی ہے۔ وہ جان کنی کی کیفیت بس وہی جانتی ہے جس کے تین جوان بیٹوں کو زخموں نے چور چور کر دیا ہو۔ کبھی وہ ایک کی طرف دوڑتی ہے تو دوسرا زخموں سے بلکنے لگتا ہے۔ تڑپ کر واپس پلٹتی ہے تو تیسرا کراہنے لگتا ہے۔ یہ آزمائش ان زخمیوں کی نہیں یہ امتحان تو اس ماں کا ہے جس کو اپنی ساری اولاد بڑی عزیز ہوتی ہے۔ تو ایسے میں وہ کس کا ماتم کرے وہ کس کی ڈھارس بندھائے۔ وہ تو اپنے حواس ہی کھو بیٹھے گی۔

بس یہی حواس باختگی کی کیفیت ہے۔ ان دنوں دھرتی ماں کی حیران و سرگرداں اپنے اطراف لہولہو وجود دیکھ کر سکتے کی سی کیفیت میں ہے۔ یہ پشاور میں ایک ہی ہفتے کے دوران تین خودکش حملوں میں کتنے گھروں کے چراغ بجھ گئے۔ کتنے بچے یتیم اور عورتیں بیوہ ہوئیں۔ کتنے والدین کی گود اجڑی، کون شمار کرے گا۔ غیر مسلم کا لہو بھی سرخ ہوتا ہے۔ اسے بھی ویسا ہی درد ہوتا ہے جیسے کسی مسلم کو۔

بلوچستان ناگہانی آفات کی زد میں مسلسل ہونے والے زلزلے اور آفٹر شاکس کی بدولت لرزہ براندام ہے۔ ملبے کے ڈھیر پر بیٹھے بھوکے لوگ اپنے تباہ ہونیوالے گھروں کو روئیں یا ان قبروں پر پھول چڑھائیں جن کے نیچے ان کے پیارے دفن ہیں۔ سر پر چھت اور پیٹ میں روٹی نہ ہو، تن ڈھانپنے کو لباس اور مریض کو دوا میسر نہ ہو تو کون کس کا درد بانٹے۔ کوئی پرسان حال نہ ہو تو آنسو بھی ساتھ نہیں دیتے۔ رونے کے لئے بھی تو کندھا چاہیے ناں! تو کس کے کندھے پر سر رکھ کر اپنا غم بھلائیں۔ بے گھری اور لاچاری صدمہ اور بھوک، کس کس درد کا علاج کریں۔ اور ادھر تو نظر کریں جہاں زخموں کے علاج کی آڑ میں مزید چیر پھاڑ

کی جارہی ہے۔ جی ہاں آپ ٹھیک سمجھے ہیں، میں کراچی کی بات کررہی ہوں۔ جہاں آپریشن اورٹارگٹ کلنگ کا دیو دن رات آدم بو آدم بو کی صدائیں لگاتا گھومتا پھرتا ہے۔ کون سانشتر ہے جونہیں چلایا جارہا۔ کمی ہے تو بس مرہم کی ہے۔ جوان زخموں کی چارہ گری کرسکے۔ کوئی رفو گر نہیں ملتا کوئی مسیحا نظر نہیں آتا جو ماں کے آنسو پونچھ سکے۔

ماں کو دکھ دینے والے جنت سے محروم کردیے جاتے ہیں۔ اسی لیے تو آج یہ دنیا جہنم کا نمونہ بنی ہوئی ہے۔ ہر طرف آگ ہی آگ ،لوگ جلتے انگاروں پر چل رہے ہیں۔ کس کا سینہ چھلنی نہیں ہے؟ کس کو سکون میسر ہے۔ سب اپنے اپنے زخم چاٹ رہے ہیں۔

کراچی کا حال تو یہ ہے کہ جیسے کسی مردہ وجود کو پوسٹ مارٹم کے لئے چیر اپھاڑا جائے اور پھر بڑے بڑے ٹانکے لگا کر سارے ثبوت چھپا دیے جائیں۔ کیا روز پندرہ سے بیس لاشیں چھپانے والے دفنانے والے اس روشنیوں کے شہر کے باشندے ہیں جہاں کبھی راتیں جاگتی تھیں، خوشیاں رقص کرتی تھیں۔ سب پاکستانی تھے۔ کوئی سندھی، پنجابی، مہاجر، بلوچ، پٹھان نہیں تھا۔ محبتیں اورلحاظ تھا اور اب لسانیت اورعصبیت نے پاکستانیت تو کیا مسلمانیت بھی چھین لی۔

اس دھرتی ماں کو اتنا نہ ستاؤ کہ اس کے دل سے بددعا نکل جائے۔ ماں تو بڑے لاڈ اٹھاتی ہے۔ بہت سی ضدیں پوری کرتی ہے۔ اپنی ہر خوشی نچھاور کرکے بچوں کو سکھ دیتی ہے۔ ہمیں بھی تو سب کچھ اس ماں کے سینے سے ملا ہے۔ نہیں ملتا تو چھین لیتے ہیں۔ پھر بھی وہ ماں ہمیں اپنی آغوش میں سمیٹ لیتی ہے۔

ایسا نہ کرو کہ ماں اپنا آنچل سمیٹ لے، اپنی گود کی گرمی سے محروم کردے، خدارا اسے اور زخم مت دو۔ اسکے زخموں پر ایسا مرہم لگا دو کہ اس کی ٹیسیں کم ہوجائیں۔ بس محبت اور درگزر کی دوا کام آئے گی۔ بھائی چارے اورحب الوطنی کا نسخہ استعمال کرو۔ ماں کے زخم بھر جائیں گے تو ٹھنڈی چھاؤں قائم رہے گی۔

☆☆☆

پُل صراط

(ام صائم۔لاہور)

اس عید قربان پر مجھے بچپن کا ایک خواب یاد آ گیا جو میں ہر عید کے دوسرے دن دیکھا کرتی تھی۔ وہ خواب یہ تھا کہ جو جانور ہم نے قربان کیا ہوتا تھا وہ میری امی کو لے کر پُل صراط پار کروا رہا ہے۔ شاید بچپن میں جو سنا کرتے تھے کہ ہماری دی ہوئی قربانی ہمیں پُل صراط پار کروائے گی۔ وہ بات ذہن میں بیٹھی ہوئی تھی۔ لیکن اب جب قرآن کو سمجھنے لگے تو پُل صراط کا مفہوم واضح ہوا۔ کہ اصل پُل صراط تو یہ دنیا، یہ زندگی ہے۔ آخرت کے پُل صراط کا عکس ہے اور یہ پُل صراط ہمارے رویوں سے پار ہوگا۔ ہمارے معاملات سے پار ہوگا کہ

اللہ اور اس کے بندوں کے ساتھ کیسے ہیں۔

کہیں ایسا تو نہیں صرف مخصوص عبادات نماز، روزہ، زکوٰۃ، قربانی کرکے اور ہم انسانیت کے حقوق ادا کرنہیں پاتے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس راستے پر چلتے چلتے ہم نے کسی کا دل دکھایا، کسی پر ظلم کیا، کسی کا حق مارا ہو پھر اس پُل صراط پر بھی گرتے پڑتے، ڈگمگاتے ہی جانا پڑے گا۔ دراصل ہمارے دین میں اتنی من گھڑت باتیں شامل ہوچکی ہیں کہ اصل دین کہیں گم ہی ہوتا جارہا ہے۔ ہم اپنی خودساختہ عبادات میں اتنے مگن ہیں کہ عبادات کے اصل مفہوم کو بھولتے ہی جارہے ہیں۔ حالانکہ ہر نماز میں ہم کتنی بار اھد نا الصراط المستقیم کی دعا کرتے ہیں۔ لیکن صراط مستقیم ہے کیا یہ جانتے نہیں۔ یہ تو راستہ ہے اللہ کے پیاروں کا۔ انبیاء کا، شہداء کا، صدیقین، صالحین کا اور ان کی رہنمائی میں چلیں گے تو یہ راستہ پار کرنا آسان ہوجائے گا۔ اور یہ راستہ تو انسانوں کے دلوں سے ہوکر گزرتا ہے۔ اور ہم اپنے دلوں میں حسد، بغض، کینہ لیے دوسروں کا دل توڑتے ہوئے خود کو بڑا اور دوسروں کو حقیر سمجھتے ہوئے یہ راستہ طے کرتے گئے تو کیا واقعی جن جانوروں کی قربانی ہم ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے لیے، نمود و نمائش کے لیے کررہے ہوتے ہیں، یہ ہمیں پُل صراط پار کروادیں گے؟

جب کہ احادیث سے تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اس راستے سے ہر کوئی اپنے نور کی روشنی کی وجہ سے گزرے گا اور وہ نور ہے قرآن وسنت کی روشنی۔ زندگی گزارتے ہوئے جو بھلائی جو روشنی اس دنیا میں پھیلی انسانیت کے دلوں کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لانے کا ذریعہ بنے گی۔ وہی روشنی وہی نور ہمارا مددگار ہوگا۔ انشاءاللہ۔

☆☆☆

انیس احمد خان

فیس بک کا استعمال

آج کمپیوٹر استعمال کرنے والا شاید ہی کوئی ایسا شخص ہوگا جو فیس بک کے نام سے متعارف نہ ہو۔ سوشل میڈیا کی فہرست میں فیس بک صف اول کا سوشل نیٹ ورک ہے جس نے دنیا بھر سے ہر مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے افراد کے آپس میں رابطوں کو آسان بنا دیا ہے۔ اس نیٹ ورک کے ذریعہ آج دنیا بھر میں کروڑوں افراد آپس میں خیالات و معلومات کا تبادلہ کر رہے ہیں۔ خود پاکستان میں 80 لاکھ سے زائد افراد اس سلسلہ سے منسلک ہیں اور فیس بک سب سے زیادہ استعمال کرنے والے ممالک میں پاکستان کا نمبر اٹھائیسواں بتایا گیا ہے۔

ہر ایجاد کی افادیت کا دارو مدار اس کے درست یا غلط استعمال (use or misuse) پر ہوتا ہے۔ درست اور مثبت استعمال سے فوائد اور غلط استعمال سے نقصانات ہوتے ہیں۔ فیس بک کے ساتھ بھی یہ ہی معاملہ ہے۔ فیس بک استعمال کرنے والے افراد اور خصوصاً دینی ذہن رکھنے والے افراد کو یہ بات ذہن میں رکھنا چاہیے کہ یہ ہمارے لیے ایک نعمت ہے جسے ہم نہ صرف اپنے ذاتی خیالات و نظریات بلکہ دعوت دین کے لیے بھی بھر پور استعمال کر سکتے ہیں۔ میں تو اسے نعمت خداوندی شمار کرتا ہوں جو گھر بیٹھے بغیر کسی تگ و دو کے مغرب کے طفیل ہمیں حاصل ہوگئی ہے۔ اس پر ہمیں اللہ کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ ہم جیسے ایک عام فرد کے لیے اخبارات اور چینل تک رسائی آسان نہیں بلکہ بعض اوقات تو ناممکن ہے۔ جب کہ یہ نیٹ ورک اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کے لیے ہمیں چوبیس گھنٹے دستیاب ہے۔ یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ نیوز میڈیا بھی سوشل نیٹ ورکس پر نظر رکھتا ہے بلکہ ان سے پریشان بھی ہوتا ہے۔ حال ہی میں عامر لیاقت حسین کو سوشل نیٹ ورکس پر کی جانے والی شدید تنقید کا سامنا کرنا پڑا جس پر اس نے جیو پر react بھی کیا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ سوشل میڈیا الیکٹرانک میڈیا پر بھی اثر انداز ہو رہا ہے۔ اس لیے ہماری ذمہ داری ہے کہ فیس بک کا استعمال مکمل احتیاط سے کریں اور میری ناچیز رائے میں درج ذیل امور کا ضرور خیال رکھیں۔

☆ مثبت اور تعمیراتی مواد خود بھی ڈالیں اور دوسروں کو بھی شیئر کریں۔ دیکھا گیا ہے کہ بعض لوگ اپنی یا فیملی کی تصاویر، فنی ویڈیوز، لچر لطیفے، عشقیہ شاعری، کارٹونز وغیرہ پر تمام زور لگاتے ہیں جو میری رائے میں مثبت استعمال نہیں۔ بہتر استعمال یہ ہے کہ دین اور تحریک کی دعوت دی جائے۔ جتنا ممکن ہو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام کیا جائے۔ قرانی آیات کے ترجمے ،

احادیث، اسلامی لٹریچر سے اقتباس، اکابرین امت کی تقریروں کے اقتباس یا ویڈیوز، امت مسلمہ کے حالات سے متعلق ملکی و غیر ملکی پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کی خبریں وتبصرے وغیرہ پوسٹ یا شیئر کریں۔ یہ تمام معلومات انٹرنیٹ پر پہلے سے موجود ہوتی ہیں البتہ انہیں نیٹ پر سرچ کرنے کی محنت ضرور کرنا پڑتی ہے۔ البتہ اس بات کو ضرور یقینی بنائیں کہ تمام معلومات مستند authentic ہوں۔ دینی معلومات کے معاملے میں تو یہ احتیاط حد درجہ ضروری ہے۔ حال ہی میں ایک دینی ادارے کی ایک پوسٹ میری نظر سے گزری جس میں حضرت عائشہ رضی تعالیٰ عنہا کو شہید بتایا گیا جو کہ غلط ہے۔ ایسی کوئی پوسٹ نظر آئے تو فوراً comments کے خانے میں غلطی کی طرف توجہ دلائیں۔ اس صورت میں اگر پوسٹ کی تصحیح نہ ہو تو بھی پوسٹ دیکھنے والا ساتھ ہی آپکا تبصرہ بھی پڑھ لے گا۔ اگر اسلام کے خلاف کوئی پوسٹ ڈالی گئی ہو تو فوری اس کا مناسب جواب دیں اور بھرپور احتجاج ریکارڈ کریں لیکن بحث برائے بحث میں نہ الجھیں۔ فرقہ واریت پر مبنی پوسٹ نہ ڈالیں اور نہ شیئر کریں۔

☆ اپنی بات دور تک پھیلانے کے لیے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنے نیٹ ورک میں شامل کریں۔ فیس بک کی زبان میں اسے friend بنانا کہتے ہیں۔ حامی، مخالف، مسلم، غیر مسلم، جوان، بزرگ، عزیز و اقارب سب کو فرینڈ بنائیں۔ لیکن حفظ مراتب کا ضرور خیال رکھیں۔ مثلاً کسی بزرگ کی پوسٹ پر تبصرہ کر رہے ہوں تو ان کا احترام پیش نظر رہے۔ فیس بک پر فرینڈ ہونے کا مطلب ہرگز یہ نہ لیں کہ وہ آپ کے برابر ہو گئے ہیں۔

☆ اگر آپ کسی کو ذاتی پیغام یا کوئی ایسا پیغام دینا چاہتے ہوں جو دوسرا کوئی نہ دیکھے تو اس کے لیے ان باکس میسج کا استعمال کریں۔ ناسمجھی میں بعض افراد اس طرح کے میسج ٹائم لائن پر پوسٹ کر دیتے ہیں اور پورے نیٹ ورک میں بات پھیل جاتی ہے۔

☆ خواتین کی تصاویر نہ ہی ڈالیں تو بہتر ہوگا۔ اسی طرح جن خواتین کو آپ مرد حضرات ذاتی طور پر نہیں جانتے ان سے فرینڈ شپ ہرگز قبول نہ کریں۔ میری رائے میں شرعاً بھی یہ درست نہیں۔ ویسے بھی اکثر خواتین کے ناموں پر مرد ہی اکاؤنٹ چلا رہے ہوتے ہیں جو بعد میں بلیک میل کرتے ہیں۔ خواتین تو اس بارے میں خصوصی احتیاط برتیں۔

☆ اسکول جانے والے بچوں کو تو فیس بک ہرگز استعمال نہ کرنے دیں کیونکہ اس سے تعلیم کا حرج ہوگا۔ انٹرنیٹ کالج اور یونیورسٹی کے طلبہ کی ضرورت ہے لہذا آپ کے جو بچے فیس بک استعمال کر رہے ہوں ان کو اپنے فرینڈز میں ضرور شامل رکھیں۔ اس طرح ان کی پوسٹس آپ کے سامنے آتی رہیں گی۔ آپ خود بھی وقتاً فوقتاً ان کا اکاؤنٹ چیک کرتے رہیں کہ کو

ئی قابل اعتراض چیز تو نہیں ڈالی گئی ہے۔ اگر خدا نخواستہ ایسا ہو تو بچے کو فوری تنبیہہ کریں۔

☆ آخری اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ کسی بھی سوشل نیٹ ورک کو لامحدود وقت ہرگز نہ دیں۔ اس کے addict نہ بنیں۔ اپنے کُل اوقات کار سے محدود وقت اس کے لیے نکالیں ۔ دفاتر وغیرہ میں تو اس کا استعمال ہرگز نہ کریں کیونکہ اس طرح آپ کے اُس کام کا حرج ہوگا جس کے لیے آپ کو مشاہرہ ملتا ہے اور یہ خیانت ہوگی۔ حال ہی میں ایک دلچسپ تحقیق سامنے آئی ہے کہ سوشل میڈیا پر وقت کے ضیاع کی بنا پر روس کی معیشت کو گزشتہ سال تقریباً تین سو بلین روبل کا نقصان اٹھانا پڑا جبکہ امریکہ کا یہ نقصان اس سے کہیں زیادہ بتایا گیا ہے۔

☆☆☆

شہید بیٹی کے نام، ڈاکٹر محمد بلتاجی کا خط

مصر میں منتخب صدر کا تختہ الٹنے والی فوج کے ہاتھوں ۱۴ اگست کے قتل عام والے دن، ڈاکٹر محمد بلتاجی کی سترہ سالہ بیٹی، اسما بھی شہید ہوگئیں۔ ڈاکٹر بلتاجی مصر کے ان منتخب رہنماؤں میں سے ایک ہیں جنہیں عوام کا اعتماد حاصل تھا۔ آج کل وہ جیل میں ہیں۔ اپنی بیٹی کی شہادت کے بعد ڈاکٹر بلتاجی نے، اسے مخاطب کرکے ایک خط لکھا ہے جس کا (انگریزی سے) اردو ترجمہ یہاں پیش کیا جارہا ہے:

''میری پیاری بیٹی اسما! میں تمہیں الوداع نہیں کہتا۔ میں یہ کہتا ہوں کہ کل ہم دوبارہ ملیں گے۔ تم نے ہمیشہ سر اٹھا کر زندگی بسر کی اور ظلم و جبر کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا۔ تم نے ہمیشہ آزادی سے محبت کی۔ تم نے اپنی قوم کی تعمیر نو اور دنیا میں اسے ایک منفرد مقام دلانے کے لئے فکر کے نئے افق تلاش کیے۔ تم نے مروجہ خیالات و افکار کو اپنے دل میں جگہ نہیں دی۔ حتیٰ کہ روایتی علوم بھی تمہارے عزائم کی تکمیل کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنے۔ تم ہمیشہ اپنی جماعت میں اوّل درجے پر فائز رہیں۔

مجھے احساس ہے کہ میں اپنی مصروفیات کی وجہ سے تمہیں زیادہ وقت نہ دے سکا، خاص طور پر تمہاری خوشگوار مجلسوں سے مستفید نہ ہوسکا۔ آخری مرتبہ ہم رابعہ العدویہ اسکوائر میں ساتھ تھے۔ تم نے پوچھا تھا کہ آپ ہمارے ساتھ ہوتے ہوئے بھی ہمارے درمیان موجود نہیں۔ اس پر میں نے کہا تھا کہ لگتا ہے کہ اس مختصر زندگی میں ہم باپ بیٹی کو مل کر بیٹھنے کا موقع نہیں ملے گا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں جنت میں ملادے۔

تمہاری شہادت سے دو دن قبل، میں نے خواب میں دیکھا کہ تم نے سفید عروسی لباس زیب تن کیا ہوا ہے اور تم خوبصورتی کا استعارہ لگ رہی ہو۔ جب تم میرے پاس بیٹھیں تو میں نے پوچھا ''یہ تمہاری شب عروسی ہے۔'' تو تم نے کہا یہ شام نہیں، دوپہر ہے۔'' شہادت کے بعد، جب لوگوں نے مجھے بتایا کہ تم بدھ کی دوپہر کو شہید کردی گئی ہو، تو میں نے جان لیا کہ اللہ نے تمہیں اپنے کام کے لئے منتخب کرلیا ہے۔ میری آنکھوں کی ٹھنڈ، عزیز بیٹی! تمہاری شہادت نے میرا یقین مزید پختہ کردیا ہے کہ ہم حق پر ہیں۔ ہمارا دشمن ہی جھوٹا اور منافق ہے۔

میرے لیے انتہائی دردناک لمحہ تو یہ تھا کہ تمہارے سفرِ آخرت کے موقع پر میں موجود نہیں تھا۔ میں تمہارا آخری دیدار بھی نہ کرسکا۔ کیا یہ میرے لیے کم اذیت ناک

ہے؟ مجھے تمہاری نمازِ جنازہ پڑھنے یا پڑھانے کا اعزاز بھی حاصل نہ ہوسکا، جس سے میرے غم کی شدت میں مزید اضافہ ہوا۔

میری لختِ جگر! میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے موت کا کوئی خوف نہیں، اور نہ ہی میں اس شخص سے خوف زدہ ہوں جو انصاف کی دھجیاں اڑا رہا ہے۔ میں تو اس پیغام کو آگے لے کر چلنا چاہتا تھا جو تمہاری روح کے ساتھ ساتھ چلا اور جو ہم سب کا مقصدِ حیات بن گیا۔ انقلاب کی تکمیل ازبس ضروری ہے۔ اب تمہارے سر کے ساتھ تمہاری روح بھی ایک قابل فخر مقام حاصل کرچکی ہے، جس نے ظالموں اور جابروں کے خلاف زبردست مزاحمت کی۔ غداری کی بندوق سے نکلی ہوئی گولیاں تمہارے سینے میں پیوست ہوگئیں۔ میں پراعتماد ہوں کہ تم نے دیانت داری اور خلوص سے خدا کے احکام کی تعمیل کی اور پھر خدا نے ہم میں سے تمہیں شہادت کے مرتبے پر فائز کرنے کے لئے منتخب کرلیا۔

میری پیاری بیٹی! میں آخر میں تم سے ایک بار پھر کہوں گا کہ میں تمہیں الوداع نہیں کہتا۔ میں یہ کہتا ہوں کہ ہم بہت جلد اپنے پیارے نبیؐ اور ان کے رفقاء صحابہؓ کے ساتھ جنت میں ملیں گے، جہاں ہماری ایک دوسرے سے زیادہ سے زیادہ ملاقاتوں کی خواہش کی تکمیل ہوگی۔

("Letter from Dr Mohamed Beltaji to his Martyred Daughter" ..... Middle East Monitor" Aug 20,2013'')

بشکریہ معارف فیچر (کراچی)

☆☆☆